غریبوں کا بہشت

اور

دوسرے افسانے

یعنی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بولی جانے والی سات مشہور زبانوں
ہندی۔ بنگالی۔ گجراتی۔ مرہٹی تامل۔ تیلگو۔ کناڑی کے گیارہ مایہ ناز افسانہ نویسوں
کے گیارہ بہترین افسانوں کا نادر مجموعہ

مترجمہ

"آتش" گوجرانوالیہ

پبلشرز

نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

بار اول ایک ہزار — سنہ ۱۹۴۱ء — قیمت ایک روپیہ

پنجاب آرٹ پریس بیرون موری دروازہ لاہور میں باہتمام لالہ گلاب چند کپور چھپا۔
اور لالہ بلراج سہگل پبلشر لوہاری دروازہ لاہور نے چھپوا کر شائع کیا۔

مقدمہ

از شاعرِ رومان جناب راجہ مہدی علی خان صاحب

"غریبوں کا بہشت اور دیگر افسانے" ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ان مایہ ناز افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن کے شاہکاروں سے ابھی اردو زبان محروم تھی۔ اس کتاب کے چھپنے سے یقیناً اردو ادب میں افسانوں کے ایک خوبصورت مجموعے کا اضافہ ہوا ہے۔

یہ کتاب ہندی۔ بنگالی۔ مرہٹی۔ گجراتی۔ کناڑی۔ تیلگو۔ اور تامل زبان کے گیارہ افسانہ نویسوں کی قوتِ فکر اور پروازِ خیال کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ایک ایسا آئینہ ہے۔ جس میں ہندوستانی کرداروں اور ہندوستانی

معاشرت کا ایک نہائیت ہی واضح اور حقیقت افروز عکس نظر آ رہا ہے۔

جونہی انگریزی تہذیب نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ یہ تہذیب نہ صرف ہماری معاشرت بلکہ ہمارے ادب پر بھی اثر انداز ہونے لگی۔ انگریزی کی کتابوں کے ہندوستانی زبانوں خصوصاً اردو میں ترجمے ہونے لگے۔ ہماری شاعری پر بھی مغربی زبانوں کا ایک خوشگوار اثر پڑا۔ غرضیکہ اردو زبان مغربی زبانوں کے تراجم سے مالا مال ہونے لگی۔ چنانچہ مغربی زبانوں کی بیشتر بڑی بڑی کتابیں اردو میں نقل ہو گئیں۔

اردو ادب کی تاریخ میں ایک ایسا دور آیا جبکہ ہمارے ادباء میں سے بیشتر نے انگریزی ناولوں اور افسانوں کا ترجمہ کرنا اپنا شعار بنا لیا۔ طبع زاد افسانوں اور دوسری طبع زاد تصنیفوں کی طرف ان کا رجحان کم ہوتا گیا۔ بلکہ انگریزی کتابوں کے ترجمے کے جنوں نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی کہ ہم نے اپنی ملکی زبانوں کے تراجم کی طرف سے اپنی توجہ بالکل ہٹا لی۔

اس میں شک نہیں کہ انگریزی ادب نے اردو ادب کو بہت فائدہ پہنچایا۔ اردو ادب کے گلشن میں رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگے اور ہمارا یہ نو امیدہ گلشن غیر ملکی سنہری پرندوں کی چہکار سے گونج اٹھا۔ لیکن اپنے اس جنون انگیز شوق میں ہم نے یعنی اردو دان طبقے نے اپنی زبانوں کو جو بلاشبہ نادر روزگار شاہکاروں سے مالا مال تھیں۔ بھلا دیا۔ اور سچ پوچھئے تو ہم اپنی ملکی زبانوں سے تغافل کرنے پر مجبور بھی تھے۔ انگریزی زبان سے ہمارا کون ادیب واقف نہیں۔ ہندوستان کا بچہ بچہ آج انگریزی بولتا اور سمجھتا ہے۔ لیکن ملکی زبانوں سے ہم نا واقف ہیں یا ناواقف رہنے پر مجبور ہیں۔ انگریزی ہمارے حکمرانوں کی زبان ہے۔ اسے حکومت

کی سرپرستی حاصل ہے۔ اور ہماری ملکی زبانیں تو گمنامی میں پڑی ہیں اس سے ظاہر ہے کہ ہمارے ادبا کا سب سے آسان راہ عمل انگریزی تھی۔

لیکن ہمت اور عزم کے سامنے اس قسم کی مشکلات حائل نہیں ہو سکتیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے بنگالی اور ہندی نے ملکی زبانوں کے تراجم کی طرف اپنی توجہ خاص طور پر مبذول کی اور آج یہ دونوں زبانیں ہمارے مختلف صوبوں کی زبانوں کے تراجم سے اگر مالا مال نہیں تو کم از کم ان سے بے التفاتی کرنے کی مجرم بھی نہیں ہیں

بہر حال مجھے دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ ہمارے صوبے کے مقتدر مترجم جناب آتش صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھا کر اردو ادب کی قابل قدر خدمت کا ثبوت دیا ہے۔

متذکرہ بالا کتاب کا ہر افسانہ میں نے بہت دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ ہمارے ملک کی چھوٹی چھوٹی زبانیں کیسے کیسے حیرتناک شاہکاروں کا خزانہ اپنی آغوش میں لئے ہوئے مغربی زبانوں کے شاہکاروں کو ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے تکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس کتاب کا ایک ایک افسانہ ہندوستانی زندگی کا ایک دلکش مرقع ہے اس مجموعے کا کون سا افسانہ ایسا ہے۔ جسے پڑھ کر ہم دل میں ایک درد۔ آنکھوں میں ایک نمی سی اور روح میں ایک بے چینی سی محسوس نہ کریں۔ افسانے کیا ہیں درد و غم محبت ناکامی۔ طرز معاشرت کی خرابیوں آنسوؤں اور آہوں کی ایک مالا ہیں۔ جسے ہر اہل دل حرز جاں بنا کر رکھ سکتا ہے۔

انگریزی کے دلدادہ نوجوان جو ہماری اپنی زبان کی کسی کتاب کا نام سنتے

ہی ناک بھوں چڑھا لیتے ہیں۔ ذرا اس کتاب کو پڑھیں اور پھر آئینے میں اپنی غمزدہ صورت دیکھ لیں یا اپنے دل کی گہرائیوں میں اس ہلکی سی دھڑکن یا اس درد کی ہلکی ہلکی ٹیس محسوس کریں۔ جو ان افسانوں کے کردار آنکھوں سے غائب ہونے سے پہلے ان کے دلوں میں چھوڑ جائیں گے۔

میں آتش صاحب کو ان افسانوں کے انوکھے انتخاب اور پھر ان کے سلیس شستہ اور بامحاورہ ترجمہ پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان سے اور ان کے پبلشر پبلیشرز نرائن دت سہگل اینڈ سنز سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ ایسے ہی افسانوں کی ایک اور کتاب اردو ادب کی نذر کریں۔

راجہ مہدی علی خان

غریبوں کا بہشت

(ہندی زبان سے ترجمہ)

اگر زندگی کی خواہش کا خاتمہ ہو جائے تو انسان ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ موت نہ آئے تو ایسا انسان خودکشی کر کے مر سکتا ہے۔ رمیش کوشش کرنے پر بھی خودکشی نہ کر سکا۔ اس کا باعث غالباً یہی تھا کہ ابھی وہ اپنے لئے نہیں۔ تو کم از کم اپنی بیوی رانی کے لئے زندہ رہنا چاہتا تھا۔

تیس برس کی عمر کا نوجوان۔ ہاتھ پاؤں مضبوط۔ دل و دماغ درست۔ زندگی کو حوصلہ سے گذارنے کے لئے تمام اوصاف سے مزین بیوی کی گھر میں موجودگی اتنے پر بھی وہ دنیا سے متنفر کیوں ہے؟ اس سوال پر اس نے کئی مرتبہ ہر طرح سے غور کیا۔ مگر اسے کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا۔

اس کے دل میں کوئی بہت بڑی خواہش نہ تھی۔ اور ہوتی کیسے؟ اس

کا تمام وقت صرف ایک سوال کے حل کرنے میں گذر جاتا تھا۔ وہ سوال تھا۔ اپنے لئے اور رانی کے لئے پیٹ بھر کر کھانا حاصل کرنا۔ گاؤں کے باہر اپنے کشادہ کھیتوں کی سلیٹ پر اپنی محنت کی پنسل سے وہ ہر روز علے الصبح یہ سوال حل کرنے میں مصروف ہو جاتا۔ اور شام تک مصروف رہتا لیکن جوں جوں اس نے اپنی مشقت بڑھائی شروع کی۔ تو وہ سوال بھی مشکل ہوتا گیا۔

بچپن میں اس نے اچھے دن دیکھے تھے۔ اچھے سے مطلب ہے۔ کبھی کبھی اسے پیٹ بھر کھانا مل جاتا تھا۔ گھی اور دودھ کا مزا بھی اس نے چکھا تھا۔ جو اُسے اب تک یاد ہے مگر وہ ماں باپ کی بدولت تھا۔ جنہوں نے اپنی جوانی کو کھیتوں پر نچھاور کر کے اس کے لئے راحت کا سامان بہم پہنچایا تھا۔ کسی کے ماں باپ ہمیشہ زندہ نہیں رہتے اور رمیش کے بھی نہیں رہے۔

ادھر غلہ سستا ہو جانے سے مشکلات دُگنی ہو گئیں کھیتوں پہ زمیندار کا حق تھا کئی پشت کھیتوں میں ہل جوتتے پر بھی اس کا موروثی حق نہیں جم سکا تھا۔ اس سے زمیندار من مانی لگان وصول کرتا تھا۔ اور اسے جھک مار کر دینا پڑتا تھا۔ نہ دیتا تو کرتا کیا؟ ۔ کسان کا لڑکا تھا۔ بغیر محنت کئے وہ رہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

ہر برس سال کے خاتمہ پر اس کے سر پر اتنا قرض ہو جاتا تھا کہ اسے تمام پیداوار کھلیان میں ہی مہاجن کے حوالے کر دینی پڑتی تھی۔ جس طرح دیگر تمام کسان ۔ نیا اناج ہی نہیں۔ نئے تفکرات کا بوجھ سر پر لاد کر گھر لوٹتے۔ ویسے ہی وہ بھی خالی دل اور خالی ہاتھ لے کر گھر لوٹتا۔ رفتہ رفتہ اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ بیل فروخت ہو گئے۔ جانور نیلام ہو گئے۔ تھالی لوٹا قرق ہو گیا۔ صرف چھپّر اور چھپّر

کے پیچھے وہ اور رانی دو شخص باقی رہ گئے۔

اتنے پر بھی کسی طرح اس نے کھیتی کا کام جاری رکھا۔ مانگنے پر بیل مل گئے پتلوں اور مٹی کے برتنوں سے کھانے پینے کا کام چلتا رہا۔ اس مرتبہ بھی ہمیشہ کی طرح جب تک فصل کھڑی رہی۔ اس کی امید بندھی رہی۔ شام کو تھکا ماندہ جب گھر آتا تب رانی سے کہتا "رام چاہے گا۔ تو اس سال ساون تک چولھا سُلگیگا اور اس کے بعد سب تکلیفیں دُور ہو جائینگی۔

اس پر اس کی بیوی جواب دیتی "پیٹ تو کسی طرح بھرہی لینگے مگر تن ڈھانکنے کے لئے کپڑا!

اس پر دونوں خاموش ہو جاتے۔ پھر کچھ اسی طرح کی باتیں کرتے۔ جاڑے کی راتیں تھیں۔ ضرورت کے مطابق کپڑے نہ تھے۔ بیچارے آگ کے سہارے اسی طرح کی باتوں میں ہی شب گذار دیتے۔

ہولی پر رمیش پکے ہوئے گیہوں لایا۔ اور رانی نے اس دن کوٹ پیس کر تھوڑے سے سرسوں سے تیلی کے یہاں سے تیل بدل کر تیل کی پوریاں بنائیں پینے کو بھنگ نہیں ملی۔ نہ سہی۔ لگانے کو عبیر نہیں ملا۔ نہ سہی۔ کپڑوں پر رنگ کے چھینٹے نہیں پڑے۔ نہ سہی مگر پیٹ تو بھر گیا۔ اور رمیش جب کھانے بیٹھا تو بولا۔ بڑی مزیدار ہیں۔ گویا گھی کی بنی ہوئی ہیں۔ رانی تیرے بنانے کی کیا تعریف کروں۔ پڑوسی کے لڑکے کو دو پوریاں ضرور دے دینا۔ کون جانے شاید اس کے یہاں چولھا بھی نہ جلا ہو۔ بیچارا لڑکا کیا جانے گا کہ آج ہولی کا تیوہار ہے"

——— وہ تو صبح ہی کھا گیا "

——— " بہت اچھا! رانی تو بڑی رحمدل ہے۔ میری ایک بات سنے گی؟

——— " کہو!"

——— " کون جانتے پھر کب پوریاں نہیں۔ اس لئے آ۔ آج میرے ساتھ بیٹھ کر دو پوریاں کھالے۔"

——— نہیں پوریاں بہت ہیں۔ تم کھالو۔ پھر میں کھالونگی۔"

فصل کاٹ کر کھلیاں میں پہنچی۔ جس دن غلہ تیار ہوا۔ مہاجن بھی آ دھمکا۔ سال بھر کا حساب کیا گیا۔ تب معلوم ہوا کہ رمیش دو من غلہ اور گھر سے دے تو تب پورا ہو۔ یہ دو من غلہ نئے قرض کی شکل میں لکھ کر مہاجن نے تمام غلہ اپنے قبضہ میں کر لیا

رات کو رمیش اپنے بھوسہ پر لیٹا۔ اور مہاجن کا نوکر رمیش کے غلہ پہ

چیت کی چاندنی رات تھی۔ دور سے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ تمام کسان اپنے اپنے کھلیاں میں پڑے مست سو رہے تھے۔ صرف رمیش جاگ رہا تھا۔ اس کی دولت آج اس سے چھین لی گئی تھی۔ اسے کیسے نیند آتی؟

وہ اپنی مصیبتوں پر غور کرتا رہا۔ اور اپنے بھوسے کے ڈھیر سے اپنے غلہ کی طرف بڑی دیر تک اس طرح ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا جس طرح دودھ دوہتے وقت گائے کا بچھڑا اپنی ماں کے تھن کی طرف دیکھتا ہے۔ رمیش کو کسی طرح یہ یقین نہ آیا کہ وہ غلہ اس کا نہیں ہے۔ بویا اس نے۔ سینچا اس نے۔ کاٹا اس نے صاف کیا اس نے؟ اور مالک بن گیا مہاجن! کیونکہ مہاجن نے

اسے قرض دیا تھا۔ پھر جتنا دیا تھا۔ اس کا ڈیوڑھا لے گیا۔ کہاں کا انصاف ہے!

رمیش کے دل میں آیا کہ اس وقت سب لوگ گہری نیند سو رہے ہیں کیوں نہ ایک بار جتنا غلہ سر پر اٹھا سکوں لے جا کر گھر میں رکھ آؤں۔ دوسرے ہی لمحہ اس کے دل میں آواز اٹھی۔ کیوں چوری کرو گے؟ ایشور دیکھ رہا ہے۔ انسان کی نظر بچا کر نکل سکتے ہو۔ مگر ایشور سے بچ کر کہاں جاؤ گے؟

پیٹ میں بھوک کی آگ بہت زور کے ساتھ روشن ہو گئی۔ اس نے کہا ایشور کوئی چیز نہیں۔ اور بھوکے کو ایشور سے کیا مطلب؟۔ اگر ایشور ہے۔ تو وہ بھوکے کو روٹی کیوں نہیں دیتا؟

ان سوالات کا جواب دینے کے لئے۔ نیکی و گناہ۔ دوزخ اور بہشت ثابت کرنے کے لئے۔ دھرم شاستروں کا ماہر کاشی کا کوئی پنڈت وہاں موجود نہ تھا۔ کل کی فکر نے زور مارا۔ اور رمیش ان باتوں پر خاص توجہ دیئے بغیر اٹھ کر اپنے ٹوکرے میں غلہ بھرنے لگا۔

جونہی وہ غلہ اٹھا کر چلنے لگا۔ مہاجن کا نوکر بیدار ہو کر اور "چور چور" کہہ کر چلانے لگا۔ جسے ایشور نے نہیں گرفتار کیا تھا۔ اسے انسان نے پکڑ لیا۔

بات کی بات میں وہاں سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ کسی نے رمیش کو برا بھلا کہا۔ کسی نے اسے مارا۔ مہاجن کے نوکروں نے رسے سے پیچھے کی جانب ...... اس کے دونوں ہاتھوں کو باندھ دیا۔ اور اسے گھسیٹتے ہوئے راتوں رات تھانہ کی طرف لے چلے۔

رانی بھی روتی سسکتی وہاں آ پہنچی۔ اس نے کہا۔ مہاجن ڈ بوڑھا

لیتا ہے۔ مگر اسے کوئی نہیں پکڑتا۔ اور کسان اپنی ہی کمائی میں سے تھوڑا بھی لینے لگتا ہے تو باندھا جاتا ہے۔ مگر اس کی کون سنتا ہے۔

چاندنی میں رشتوں سے جکڑا ہوا بے کس ناتوان رمیش اور اس سے بھی زیادہ ناتوان اس کی عورت نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے پر گہری اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ بسنت کی اس چاندنی کو ان پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔ اس نے دونوں بیوی۔ شوہر کو اپنی پوری قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

(۲)

صبح صادق نمودار ہوئی۔ سال بھر کی کمائی آج گھر آنے والی تھی۔ مگر کمائی کے ساتھ رانی کمانے والے کو بھی آج گنوا بیٹھی۔ ایسے موقعوں پر گاؤں میں خاص کر عورتوں میں ہمدردی کی کمی نہیں ہوتی۔ پاس پڑوس کی عورتیں رانی کے گھر آ بیٹھیں۔ اور اسے سمجھانے لگیں۔ مگر رانی جس کا سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔ جس کا مال و متاع سب لوٹ لیا گیا ہے ان باتوں پر خاص توجہ نہیں دیتی اور رہ رہ کر.... وہ کہتی "وہ چور نہیں ہیں۔ وہ کسی کا ایک دانہ بھی نہیں چھو سکتے۔ اپنا غلہ تھا۔ اپنے گھر لا رہے تھے۔ مہاجن کھلیان میں بیٹھنے والا کون ہوتا ہے۔ گھر میں اس نے دیا تھا۔ گھر سے لیتا۔ کہیں بھاگے تھوڑے ہی جا رہے تھے۔ اس سال نہیں تو اگلے سال اس کا سب کچھ ادا کر دیتے۔"

آہ! اس کا نام رانی کس نے رکھا تھا۔ رانیاں کیا ایسی ہی بے کس

ہوتی ہیں۔ اُسے دولت کی ہوس نہ تھی۔ اس دنیا میں اس کا صرف ایک سہارا محنت سے چوٹہ۔ بھوک کی مار کو اس سے بھی زیادہ برداشت کرنے والا اس کا شوہر تھا اور آج وہ بھی اس سے چھین لیا گیا۔

”وہ کب آئیں گے؟“ رانی نے اپنی پڑوسنوں سے کہا۔

ایک نے جواب دیا۔ آج تھوڑے ہی چلے آئیں گے۔ ابھی ان کے ہاتھ میں ہتھکڑی پڑے گی۔ وہ جیل خانہ میں بند ہونگے۔ وہاں سے عدالت میں لے جائیں گے۔ وہاں حاکم ان سے پوچھے گا تم نے چوری کی؟۔ وہ کہیں گے۔ ہاں! بس سزا سنا دیگا۔ وہ جیل خانے میں بند ہو جائینگے۔ سزا پوری بھگت چکنے کے بعد تب گھر واپس آئینگے۔

دوسری نے جواب دیا۔ بالکل درست! گذشتہ سال میرے شوہر بھی گرفتار ہو گئے تھے۔ میں ان کے ساتھ ساتھ جیل کے پھاٹک تک اور پھر عدالت تک گئی تھی۔ میں نے اپنے زیور فروخت کرڈالے۔ اور سپاہی کو مٹھائی کھلائی۔ تب مجھے ان کے ساتھ ساتھ جانے کی اجازت ملی تھی عدالت میں پہنچ کر میں نے بھی ارادہ کیا کہ کچھ کہوں۔ مگر بولنے کی اجازت نہ ملی۔ معلوم ہوا کہ اگر کچھ بولونگی تو تو ہین عدالت کے جرم میں گرفتار کرلی جاؤنگی۔ مجھ سے کہا گیا اپنا وکیل لے آؤ۔ اور وکیل لیتا ہے پیسہ! پھر جیسا پیسہ ہو ویسا وکیل ملتا ہے۔ میں نے دیکھ لیا کہ عدالت میں وہی مقدمہ جیتتا ہے۔ جس کے پاس پیسہ بہت ہوتا ہے۔ پیسہ دیکر وہ بہت سے اشخاص جمع کر لیتا ہے۔ وہ اسی کی طرف سے بولتے ہیں۔ اور غریب بیچارے کی طرف سے کون بولے؟ میرے شوہر کو سزا ہوگئی۔ مگر

انہوں نے زمیندار کو پیٹا تھا۔ وہ زمیندار کو مار کر جیل گئے تھے۔ اور رمیش نے تو چوری کی ہے۔ رمیش کی کوئی نہیں سنے گا۔

رانی جوش میں آگئی۔ کہنے لگی "اپنی چیز اپنے گھر لا رہے تھے۔ چوری کا ہے کی۔؟"

ایک اور پڑوسن نے کہا۔ بھنگا پاسی کو گذشتہ سال چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی مگر اس کا قصور کیا تھا؟ وہ زمیندار کے کھیت میں سے صرف باجرے کی بیس پھلیاں لے آیا تھا۔ رمیش کو اس سے کم سزا نہ ہوگی۔

اس طرح ہر روز رانی کے گھر میں گاؤں کی عورتیں جمع ہوتیں اور جیل عدالت اور سزا کی باتیں کرتیں۔ رانی اپنے شوہر کو دیکھنے کے لئے۔ اس سے ملنے کے لئے پریشان ہوگئی۔ اس کے پاس فروخت کرنے کو زیور بھی نہیں تھے۔ سپاہی کو کیا دیتی؟ وکیل کو کیا دیتی؟

ایک ہمسائے کا لڑکا شہر میں پڑھتا تھا۔ اس نے رانی کو مفت بغیر کچھ خرچ کئے اس کے شوہر سے ملاقات کرانے کا وعدہ کیا۔ اور اسکو لے کر شہر کو روانہ ہوا

جیل کا پھاٹک دیکھ کر رانی خوف سے کانپ اُٹھی۔ پہرہ داروں نے کہا۔ ایک روپیہ دو تو تیرے شوہر سے ملاقات کرادیں۔ رانی اپنا سر دے سکتی تھی مگر روپیہ اس کے پاس کہاں تھا؟۔ ہمسائے کا لڑکا اس کی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ میرے پاس ایک روپیہ ہے۔ میرے والد نے مجھے خرچ کے لئے دیا تھا مگر چاچی تم اسے سپاہی کو دے دو۔ میرا کام کسی طرح چل جائے گا۔

شوہر سے ملاقات کی خواہش نے رانی کی غور کرنے کی طاقت زائل کردی

اس نے لڑکے سے روپیہ لیکر پہریدار کو دے دیا۔ رمیش جیل کے پھاٹک پر لایا گیا۔

شادی کے بعد آج رانی نے اسے پہلی مرتبہ سر سے پاؤں تک کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ گھٹنوں تک جانگھیا۔ جانگھیئے کے اوپر قمیض۔ سر پر ٹوپی۔ اپنے شوہر کو اس لباس میں دیکھ کر اسے خوشی ہوئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا "جہاں بھی رہو۔ خوش رہو۔"

رمیش نے کہا "رانی! تجھے شہر تک آنے کا حوصلہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر میرے غرور کا آج ٹھکانہ نہیں ہے۔ میری قیامت کرنا۔ کُل چھ مہینے کی سزا ہو گئی ہے یہ بیساکھ کا مہینہ ہے۔ ایک ماہ کی رخصت ملے گی۔ بھادوں میں گھر آجاؤں گا۔

رانی نے پوچھا "یہاں کھانے کو کیا ملتا ہے۔"

"یہ نہ پوچھو رانی! بڑا سکھ ہے۔ دونوں وقت روٹی دال اور ساگ ملتا ہے۔ امیروں کا بہشت تو میں نہیں بتا سکتا کہ کہاں ہے۔ مگر غریبوں کا۔ کسانوں کا۔ بہشت یہیں ہے۔ رامو سے۔ کالکا سے۔ چودھری سے میری طرف سے کہہ دینا کہ چوری کی سزا بہشت ہے۔ خالی ہاتھ۔ خالی پیٹ وہاں کیا بیٹھے ہیں قصور کریں اور یہاں آکر کچھ روز میہمانی کریں۔ میری پوشاک دیکھ! اپنی ہوش میں اتنے کپڑے تو کبھی پہنے نہیں۔ اوڑھنے بچھانے کو دو کمبل ملے ہیں۔ رانی! تیری فکر نہ ہوتی تو یہیں زندگی گذار دیتا۔"

ہمسائے کے لڑکے نے پوچھا "یہاں کام نہیں کرنا پڑتا؟"

—— کام یہاں سخت کرنا پڑتا ہے۔ دن دن بھر چکی چلانی پڑتی ہے

مونج بٹنی پڑتی ہے۔ پانی کھینچنا پڑتا ہے۔ مگر اس محنت کے عوض خراب ہی سہی پیٹ بھر روٹی تو ملتی ہے۔ اور وہاں گاؤں میں کیا ہے؛ محنت بھی کرو اور بھوکے بھی رہو "

پھر وہ رانی سے مخاطب ہوا۔ چھ ماہ کا عرصہ کوئی طویل عرصہ نہیں ہوتا۔ برسات میں اگر گھر گر جائے تو گر جانے دینا۔ کھیتی باڑی کی فکر نہ کرنا۔ گرمی میں آم کی گٹھلی برسات میں سبزی ترکاری کھا کر گذر کر لینا۔ میں آؤنگا تب دیکھا جائے گا۔

پھاٹک کے سپاہیوں نے کہا۔ بہت باتیں کر چکے۔ چلو اندر!

رانی نے اپنی بغل سے ایک پوٹلی نکالی۔ رمیش نے پوچھا کیا ہے؟

"تھوڑا سا چنا لیتی آئی تھی۔ اسی کے عوض یہ مٹھائی لے آئی ہوں تمہارے واسطے "

—— " رانی تو مجھے ہمیشہ بچہ ہی سمجھے گی " خیر لا "

رمیش نے پوٹلی لے لی۔

سپاہی نے اس کے ہاتھ سے پوٹلی چھین کر پھاٹک سے دور راستے میں پھینک دی۔ اور اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بولا " بس بہت ہوا اندر چل جیل میں باہر کی خوراک نہیں لی جاتی "

سپاہی کی بات کی پروانہ کرتے ہوئے رمیش نے پھر کہا —— " رانی! فکر مت کرنا۔ چھ ماہ کا عرصہ کوئی لمبا عرصہ نہیں ہوتا۔ یون ہی گذر جائیگا "

سپاہی دھکیلتا ہوا اُسے اندر لے گیا۔ رانی اپنا دل مسوس کر رہ گئی کاش دنیا رمیش کو رانی کی نظروں سے دیکھتی!۔ کاش عدالت اس سے پوچھتی

تو نے کیوں چوری کی ؟ ـ سرکار اگر جیل کے اندر اس کے کھانے کی جیسی فکر رکھتی ہے ـ ویسی ہی جیل کے باہر بھی رکھتی تو کیسا اچھا ہوتا ؟

رانی نے اپنی پوٹلی سڑک پر سے اُٹھا لی ـ جس طرح کوئی بھگت اپنے دیوتا کو کچھ لذیذ میوے نذر کرتا ہے ـ اور پوجاری دیوتا کے پاس اُن لذیذ میوؤں کو لے جا کر انہیں پھر بھگت کو واپس کر دیتا ہے ـ ویسے ہی رانی نے اُس پوٹلی کو سڑک پر سے اٹھایا تھا ـ اس میں اس کے شوہر کا ہاتھ لگا تھا ـ اس نے اس سے اپنی بے عزتی ذرا بھی محسوس نہیں کی ـ

(۳)

گاؤں میں واپس آنے پر رانی اپنے شوہر کے آنے کے دن گننے لگی ـ چار برس کا اس کے ایک چھوٹا لڑکا تھا ـ جو اپنی نانی کے پاس رہتا تھا ـ وہاں اُسے کھانے پینے کا آرام تھا ـ رمیش کی گرفتاری اور سزا کی خبر سن کر اس کی بوڑھی بیوہ ماں نے ایک آدمی بھیج کر رانی کو اپنے ہاں چلے آنے کو کہا ـ مگر رانی نے جانے سے انکار کر دیا ـ کیا معلوم اس کے شوہر کب آ جائیں ؟ تب وہ کہاں جائیں گے ؟ کیا کھائیں گے ؟ ـ اس فکر نے اسے گھر نہ چھوڑنے دیا ـ رہی بات اپنے کھانے پینے کی ـ سو اس کو اس کی خاص فکر نہ تھی ـ پھر اپنی ماں کی حالت سے بھی وہ واقف تھی ـ بڑھیا ـ بزرگوں کی کمائی سے کسی طرح گذر کر رہی تھی ـ بڑھاپے میں دل بہلانے کے لئے اس نے اپنے دوہتے کو اپنے ہاں بلا لیا تھا ـ وہی اس پر کیا کم بوجھ تھا ؟

چھ ماہ کا عرصہ کوئی طویل عرصہ نہیں ہوتا ـ رانی نے اپنے شوہر کے

گھر پر ہی رہ کر اس عرصہ کو گذارنے کا ارادہ کر لیا۔ رمیش کا ایک آموں کا باغ تھا مگر قرض کی وجہ سے وہ بھی بک گیا تھا۔ مہاجن نے اس سال باغ کو آرائیں کے پاس فروخت کر دیا تھا۔ ارائیں اپنا ڈیرا ڈال کر اسی باغ میں پڑا تھا۔

بیساکھ کے بعد جیٹھ آیا۔ جیٹھ کی لمبی دوپہر کاٹے نہ کٹتی۔ جب جی اُکتا جاتا تو رانی اسی باغ میں چلی جاتی۔ وہ اس کا باغ تھا۔ بہت سے درخت اس کے سسر کے لگائے ہوئے تھے۔ فروخت ہو گیا تھا تو کیا؟۔ اس باغ سے اس کا ایک طرح کا خاندانی تعلق تھا۔ اس باغ پر اب اس کا قبضہ نہ ہونے پر بھی وہ اسے اپنا ہی سمجھتی تھی۔ وہاں جانے میں وہ کسی قسم کی بے عزتی محسوس نہ کرتی تھی۔

وہ ارائین کے بال بچوں کو اس باغ کی کہانیاں سنایا کرتی۔ کس درخت کے آم کتنے شیریں ہیں۔ وہ بتاتی کس درخت کے پھلوں کا آچار اچھا بنتا ہے وہ انہیں بتایا کرتی۔ ایک درخت ایسا بھی تھا جس میں بھادوں میں آم پکتے تھے وہ درخت بھی اس نے آرائین کو بتا دیا۔ ارائین اس درخت سے اور زیادہ فائدہ اٹھانے کی بات سوچنے لگا۔

رانی ارائین کے بال بچوں سے ہی دل نہ بہلاتی۔ باغ سے جانوروں کو بھگانے اور پکے آم چننے میں بھی وہ ان کی خاطر خواہ مدد کیا کرتی تھی۔ یہ سب کام وہ اپنا ہی سمجھ کر کرتی۔ اور کرتی کیوں نہ؟ باغ اسی کا تھا۔ اس پر اس کا قبضہ اب پہلے ہی نہ رہ گیا ہو۔ پھر مہاجن باغ کو قیمت مل جانے پر واپس کر دینے کو تیار بھی تھا۔ اس کے دل میں یہ بھی اُمید تھی کہ کبھی اس کے پاس پیسے ہوں گے تو باغ اسے پھر واپس مل جائیگا۔

شام کو چلنے لگتی تو آرائین اسے کسی دن چار۔ کسی دن پانچ اور کسی دن دس آم تک مفت دے دیتا۔ یہ ہی آم اس کی زندگی کے وسیلہ تھے۔ ان آموں کو وُہ لذت کے لئے نہیں۔ زندگی بچانے کے لئے۔ اپنے شوہر سے پھر ملاقات کرنے کیلئے کھاتی تھی۔ مگر ایک دن کے آم وہ ہمیشہ دوسرے دن کھایا کرتی تھی۔ کیا معلوم سرکار کو رحم آجائے اور وہ اس کے شوہر کو رہا کر دے۔ اسی امید سے ہر روز وہ تازہ آم شوہر کے لئے رکھ چھوڑتی تھی۔ رات کو وہ لیٹی لیٹی شوہر کی آہٹ سنا کرتی تھی۔ ذرا بھی آہٹ پاتی تو چونک کر اٹھ بیٹھتی۔ صحن سے نکل کر دروازے تک آتی۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی اور پھر مایوس ہو کر لوٹ جاتی۔ اس کے مکان کے دروازے پر نیم کا درخت تھا۔ اس کے گنجان سایہ میں اس کے ہمسائے دوپہر کے وقت بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی خاطر تواضع کرنے کے لئے اس کے گھر میں پان سپاری نہ تھی۔ مگر گھر میں ایک گھڑا ٹھنڈا پانی بھر کر رکھ جاتی اور ہمسائے کی لڑکوں سے کہہ جاتی کہ کوئی پانی مانگے تو اپنے گھر سے لوٹا لا کر پلا دینا۔

اس کے گھر میں داخل ہونے کی کسی کو ممانعت نہ تھی۔ چوپال میں داخل ہونے پر ایک پرانا کیواڑ دروازے میں لگا ملتا تھا۔ اس سال رمیش کے سامنے ہی کسی نے اکھاڑ کر ہولی میں ڈال دیا تھا۔ تب ارنڈ کی لکڑی کا ایک تنہ کیواڑ کی جگہ لگایا تھا۔ جسے رانی نے خود ہی لڑکوں کی مدد سے بنایا تھا۔ ایک چارپائی تھی۔ جو دن کے وقت باہر نیم کے درخت کے نیچے گاؤں والوں کے بیٹھنے کے لئے پڑی رہتی تھی۔ اور وہ رات کے وقت سونے کے لئے اسے صحن میں لے آیا کرتی تھی۔

گاؤں والوں میں سے کسی نے یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ رانی

کیا کھا کر جیتی ہے۔ انہوں نے سمجھا تھا کہ رمیش ضرور کچھ گھر میں رکھ گیا ہو گا۔ جب چوری میں پکڑا گیا ہے تب ضرور۔ اس نے پہلے بھی کچھ چھپایا ہو گا۔ کون جانے گھر میں کچھ نقد روپیہ بھی کہیں چھپا کر رکھا ہو۔ اس لئے رانی پر کیا گذر رہی ہے۔ اس پر کسی نے کبھی توجہ ہی نہ دی۔

جیٹھ گذر گیا۔ ہاڑ آیا۔ کھیت اور راستے سبزی سے ڈھک گئے۔ اس نے سوچا شاید سرکار کھیتوں میں ہل جوتنے اور بیج بونے کا آغاز سمجھ کر اس کے شوہر کو رہا کر دے۔ وہ اور بھی اشتیاق کے ساتھ اپنے شوہر کے آنے کی راہ دیکھنے لگی۔

گاؤں میں سب کے گھر مٹی سے لیپے گئے۔ مگر رانی کا گھر بغیر مرمت کے ہی رہ گیا۔ اور برسات میں اس کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو گیا۔

بیچاری ابلا ہل۔ بیل کا بھی انتظام نہ کر سکی۔ اس کے کھیت زمینداروں نے دوسروں کے حوالے کر دیئے۔ کوئی ہل پھال درست کراتا۔ کوئی کھیتوں میں کھاد پھینکنے جاتا۔ کوئی بیلوں کے لئے گھاس کاٹ کر لاتا۔ مگر رانی کے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے پر بیٹھی مایوس آنکھوں سے سب کو کام کرتے دیکھتی ہوئی اپنے شوہر کی آمد کی راہ دیکھتی رہتی۔

چولہا اسی دن سے نہیں جلا تھا۔ جس دن رمیش پکڑا گیا تھا۔ گھر میں کچھ تھا ہی نہیں جو پکاتی۔ اگر کچھ ہوتا تو بھی شاید اس سے پکایا نہ جاتا۔ اکیلے اپنے لئے اس نے کبھی کھانا نہیں بنایا تھا۔ اس طرح وہ دن بدن ناتوان اور کمزور ہوتی گئی۔ جب چلتی تب اس کے پاؤں لڑکھڑاتے۔ آموں کی گٹھلیاں اس نے گھر کے ایک کونے میں جمع کر رکھی تھیں۔ جب بھوک بہت بے چین کرتی تب دو چار گٹھلیاں

توڑ کر کھاتی اور ایک لوٹا پانی پی لیتی۔ گھر کے صحن میں پڑوسن کے یہاں سے بیج لاکر اس نے لکڑی بو دی تھی۔ وہی اس کی کھیتی تھی۔ باقی ماندہ زندگی کا وہ ہی سہارا تھیں وہ اپنے دل میں کہا کرتی "جب تک وہ آئیں گے۔ لکڑیاں ضرور تیار ہو جائیں گی دس پانچ دن آرام سے کھائیں گے۔ پھر دیکھا جائیگا۔ کھیتوں میں دانہ پڑ ہی گیا ہے محنت مزدوری مل ہی جائے گی۔

اب اس کے لئے دروازے سے اُٹھنا بھی مشکل ہو گیا۔ چوپال میں بھی جھاڑو لگاتی تو ہانپ جاتی۔ ایک دن کا پانی بھرا ہوا کئی دن پیتی جان پڑتا تھا کہ اس کی جان اب صرف شوہر کے دیدار کرنے کے لئے ہی اٹکی ہوئی ہے۔ مگر انسانوں سے آباد اس بستی میں رانی کو اس طرح موت سے جنگ کرتے ہوئے دیکھ کر بھی کسی نے اس سے اس کی دل کا حال نہ پوچھا۔

گنتے گنتے آخر وہ دن بھی آگیا۔ گاؤں کے لڑکوں نے آکر خبر دی کہ رمیش آ رہا ہے رانی کے جسم میں یکایک نہ جانے کہاں سے طاقت آگئی۔ شوہر کو اس کی حالت دیکھ کر رنج نہ ہو۔ اس لئے اس نے پانی لگا بالوں میں کنگھی کی۔ شادی کے وقت کی ایک ساڑھی جسے کہیں کہیں دیمک نے کاٹ کھایا تھا۔ اس نے پہن لی۔ اور مانگ میں سیندور لگا کر صحن میں اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ وہ شوہر کو کھلانے کے لئے ملائم ملائم لکڑیاں توڑنے لگی۔ یکایک رمیش نے باہر سے ہی آواز دی " رانی! میں آگیا "

رانی دوڑ کر اس کے پاؤں سے جا کر لپٹ گئی۔ مگر دل کھول کر رو نہ سکی۔ آج خوشی کے خیال سے وہ اپنے دل کی تمام تکالیف کو ایک دم نکال کر دل

کے باہر پھینک دینا چاہتی تھی۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔
رمیش نے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر ارے یہ کیا؟ وہ اٹھتی کیوں نہیں؟۔ گاؤں کے ایک بوڑھے شخص نے کہا۔ اس کے جسم میں جان بھی ہے۔ جو اٹھے۔ رمیش نے زور سے پکارا "رانی! رانی!! اب تو بھی مجھے اس مصیبت میں اکیلا چھوڑ دیگی"
مگر رانی نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کے گوشت اور خون سے خالی خشک چہرے پر ایک عجیب قسم کی خوشنودی کھیل رہی تھی۔ گویا وہ رمیش سے کہہ رہی تھی "پیارے تم مرد ہو۔ میں نہ رہونگی تو تمہیں کمانے کی بہت فکر بھی نہ کرنی پڑیگی۔ اور جب کسی طرح پیٹ نہ بھر لگا تب اپنے "اسی غریبوں کے بہشت" میں چلے جاؤ گے۔

سہاگ کا دھاگہ

(تیلگو زبان سے ترجمہ)

رات کے نو بجے تھے۔ بالا ابھی باورچی خانہ میں بیٹھی اپنے شوہر کے جوٹھے برتن میں کھانا پروس رہی تھی۔

رام ناتھ برامدے میں چارپائی پر بیٹھا تھا۔ دس منٹ پیشتر جب وہ کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کے لئے باہر گیا تب اس کا دوست شیکھر چپ چاپ بغیر کچھ کہے اپنی راہ پکڑتا تو بہت اچھا ہوتا۔ مگر وہ رام ناتھ کے پاس آکر دھیمی آواز میں کہنے لگا ”دیکھو رام ناتھ! آج رات کو کلب میں کھیل ہوگا۔ اس کھیل میں بڑے بڑے معزز اصحاب تشریف لائیں گے۔ ہمارے زمیندار کا لڑکا بھی کھیل دیکھنے کو آئیگا۔ تم بھی آؤ گے نہ؟ کیوں؟“ شیکھر کی اس خوشخبری نے رام ناتھ کے دل کے زخم پر جو مندمل ہو رہا تھا۔ نمک کا کام کیا۔ وہ خیالات کی لہروں میں بیدم ہونے لگا وہ گھٹنوں پر کہنیاں رکھ سر جھکا کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے سے

عاجزی ٹپک رہی تھی۔ آنکھیں فکر میں غلطاں زمین کی طرف جھانک رہی تھیں۔
تاش کے باعث باپ اور بیٹے کو الگ ہونا پڑا۔ باپ کے یہاں سے اپنا حصہ بانٹ لینے کے بعد رام ناتھ نے بیس ایکڑ کی زمین برباد کر دی۔ آخر بالا کے زیورات بھی فروخت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ تاش کی اس بڑی عادت سے تنگ آکر ایک ماہ پیشتر رام ناتھ نے اسے نہ چھونے کی قسم کھائی تھی۔ مگر شیکھر کے آنے کے بعد پھر تاش کھیلنے کی خواہش نے زور پکڑا۔

تب کئی سالوں کے تجربے نے (جو اسے جوئے میں اپنا تمام سرمایہ برباد کر دینے سے حاصل ہوا تھا۔) چٹکی بجاتے ہوئے آگے بڑھ کر کہا "خبردار! اتنا نقصان اٹھانے پر بھی تمہاری عقل اب تک ٹھکانے نہیں لگی! کیا دولت کے ساتھ ساتھ تمہارا ضمیر بھی کہیں چلا گیا۔ ذرا سوچو تو! تمہارا جسم دن بدن لاغر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ تمہاری عزت مٹی میں مل گئی ہے۔ کیا اس تاش کی عادت نے ہی تجھے غریبی کا منہ نہیں دکھلایا؟ ۔ کیا تم نے کبھی اس معاملہ پر غور بھی کیا ہے۔ تمہارے بزرگوں نے خون پسینہ ایک کر کے جو پیسہ کمایا تھا۔ اور بڑی احتیاط سے جس کی حفاظت کرتے چلے آئے تھے۔ ایک لمحہ میں ــــ پلک مارتے ہی ــــ ایک کوڑی بچے بغیر تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔ کیا وہ اس تاش کی بڑی عادت کے پیچھے نہیں گیا۔ ہر مرتبہ تجھے جوئے میں ہارنے کے سوا اور کیا فائدہ ہوا۔ شائد اس بار جیت سکوں گا۔ اس طرح اپنے دل کو دھوکہ دیتے ہوئے۔ تم نے جیتنے کے لئے کئی مرتبہ بے فائدہ داؤ نہیں لگائے۔ اس جوانی میں عقل حاصل کرنا تو دور رہا۔ تاش ملاتے ہوئے۔ اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتے ہوئے۔ کبھی کبھی ایک آدھ مرتبہ جیتنے

پر بھی کافی فائدہ کہتے ہوئے ــــــ مرگ ترشنا میں پڑکر کتنی دفعہ اپنا قیمتی وقت تم نے بے فائدہ نہیں گنوایا ــــــ اب بھی ہوش میں آؤ۔ تاش جوا انسان کو تباہی کی جانب لے جانے والی نیز شاہراہ زندگی میں کانٹے بکھیرنے والی چیزیں ہیں

"اوہ" کہتے ہوئے رام ناتھ نے ایک گہری سانس لی۔ ــــــ جیسے کوئی مزدور بڑا بھاری بوجھ اٹھاتے ہوئے تھک گیا ہو۔

چارپائی پر سے اٹھ کر وہ ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ باپ کے یہاں سے الگ ہونے کے بعد ــــــ اب تک ــــــ ان دو سالوں میں ــــــ اس نے جو نفرت انگیز کام کیا تھا اسے یاد کر کے ایک ناقابل بیان دلی کیفیت کو محسوس کیا۔ اور اس طرف سے اپنے دلی ارادے کو بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔

جنوبی سمت کی کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر اس نے باہر میدان کی طرف نظر ڈالی۔ چاندنی چھٹک رہی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا ہوا کے تیز و تند سرد جھونکے اندر داخل ہوکر اس کے چہرے کی رونق کو دوبالا کرنے لگے۔

وہ آہستگی سے گنگنانے لگا۔ اب تقریباً ساڑھے نو بجے ہونگے۔

پردے کی آڑ سے موہ مایا کی آواز نکلی "ہاں! ایک آدھ گھنٹے میں کھیل شروع ہو گا"

"کیا میں بھی چلوں!"

"صرف آج رات کو کھیلنے جاؤ گے تو ایسا کون سا عہد ٹوٹ جائیگا"

"مگر میرے پاس تو اس وقت ایک کوڑی بھی نہیں ہے"

"بالا سے ذرا جاکر پوچھو تو!"

اس بیچاری کے پاس ہے ہی کیا؟ جو کچھ تھا وہ سب کچھ مجھے دے چکی؟

"صرف بچا ہے اس کے گلے میں ایک ——"

"وہ کام کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔"

"ایسا مت کہو۔ کون جانے شاید اس مرتبہ تمہاری قسمت جاگ اُٹھے۔ مایوس مت ہو"۔

جیسا ہو۔ آج رات کو کھیلنے کے لئے میری جان تڑپ رہی ہے۔

رام ناتھ پیچھے مڑکر خواب گاہ کے دروازے پر آیا۔ بالا اندر بستر بچھا رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی کھانا کھا باورچی خانہ صاف کرکے آئی تھی۔

(۲)

بالا بالکل بھولی بھالی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر قدرے اطمینان۔ نیز آنکھوں سے ہر وقت خوشی دکھائی دیتی تھی۔ پتھر کی مانند سخت دل رکھنے والا بھی اس کا بشاش چہرہ دیکھ کر پگھل جاتا تھا۔ جوا کھیلتے کھیلتے اس کے شوہر نے جائداد ہی نہیں —— گھر کا سامان تک بھی فروخت کر ڈالا تھا۔ چھ مہینوں سے وہ روٹی کے لئے بھی ترسنے لگے۔ اپنے زیورات نیز آئندہ زندگی کا قیمتی سُکھ لوٹنے والے شوہر پر وہ ذرا بھی غصے کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ جیسے تیسے —— اپنے مالک کو کھلانا اور سب طرح سے اسے خوش رکھنا ہی اس نے سیکھا تھا۔ اس کی اس نرم طبیعت پر مہیلا سماج حیرت کا اظہار کرتا تھا کہ ایسے زمانے میں اس طرح کی بھولی بھالی لڑکی آخر کیونکر پیدا ہوئی۔

بالا اپنے ساس سُسر کی لاڈلی بہو تھی۔ یہاں تک کہ وہ اسے

اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے تھے۔ وہ اپنے بیٹے کی نسبت بہو کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

جب رام ناتھ اپنے باپ سے لڑ جھگڑ کر جائیداد تقسیم کرا اسی گاؤں میں ایک دوسرے مکان میں رہنے کو جا رہا تھا۔ تب اس کی ماں بالا کو اپنے آنچل میں چھپا کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ اب بھی وہ کبھی کبھی بالا کو دیکھنے آیا کرتی تھی۔ بیٹے کے برے چلن سے بخوبی واقف ہونے کے باعث وہ جب کبھی آتی تھی۔ تو اپنی بہو کو کچھ نہ کچھ دے جاتی تھی۔ جس سے بہو کسی قسم کی تکلیف نہ اٹھائے۔ بالا جہاں تک ہو سکے اپنے لئے خور دنی جمع کیا کرتی تھی۔ اور جو کچھ باقی بچ رہتا تھا اسے اپنے شوہر کے جیب خرچ یا جوئے کے لئے پوچھنے پر دے دیتی تھی۔ رام ناتھ جوئے میں سب کچھ گنوا کر بھی بالا کی وجہ سے ہی اب تک ٹھیک وقت پر کھانا حاصل کر رہا تھا۔

اس کے باپ کو اس کی اس بری حالت پر ترس نہیں آتا تھا۔ اگر اس کے باپ کو معلوم ہوتا کہ میری بیوی بالا کو کبھی کبھی مجھ سے کہے بغیر پیسہ دے رہی ہے۔ تو شاید وہ کبھی کا آگ بگولا ہو گیا ہوتا۔ اگرچہ بالا کے ساتھ اس کو بے حد محبت تھی۔ اور وہ بالا کو خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ تاہم اس کا یہ خیال تھا کہ اس کا بیٹا جس قدر ہو سکے زیادہ سے زیادہ تکالیف کا مزا چکھے تاکہ وہ کسی طرح راہ راست پر آ جائے۔ اس نے کتنی ہی مرتبہ اپنے بیٹے کو طوطے کی طرح پڑھایا تھا کہ بیٹا! تاش کا کھیل ہمارے لئے نہیں۔ اس کے باعث کئی لکھ پتی گداگر بن گئے۔ وہ انسان کو غریبی کی طرف دھکیل کر لے جاتا ہے۔ وہ

انسان کو بُرے سے بُرے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ بدچلنی کا الزام بھی سر پہ لگتا ہے۔ اب بھی سنو۔ پیچھے پچھتانے سے کچھ ہاتھ نہیں لگیگا۔ لیکن کیا رام ناتھ نے ان نیک ہدایت کی طرف ذرا بھی توجہ دی۔

تجربہ کار اشخاص کا قول ہے کہ اگرچہ گورو کے الفاظ نہایت سادہ اور صاف ہوتے ہیں مگر پھر بھی ناداں شخص سورج کی شعاعوں کی طرح ان الفاظ کو اذیت پہنچانے والا سمجھ کر ان پر عمل کرنے سے گریز کرتا ہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ رام ناتھ نے اس کا بھلا چاہنے والے باپ کی نیک ہدایت کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی۔ کوٹ پتلون پہن کر شرافت کا سوانگ بھر کر جن دوستوں نے اُسے جوئے کھیلنے کی بُری عادت ڈالی تھی ان ہی کی باتوں پر اس نے اعتبار کیا۔ امیر ہونے کے باعث ہی دوستوں نے اپنی غرض پوری کرنے کے لئے رام ناتھ کو اپنے جال میں پھنسا یا تھا اس میں کچھ شک نہیں کہ رام ناتھ نرم طبیعت کا انسان تھا۔ وہ حلیم بھی تھا۔ اور آسانی سے فوراً ہر کسی پر اعتبار کر لیتا تھا۔ ان ہی نیک اوصاف نے اسے ناتوان اور بے کس بنا دیا۔ جو دیکھنے میں نیک معلوم ہوتے تھے۔ ان پر اعتبار کر کے وہ سمجھتا تھا کہ یہ اپنے اصولوں سے کبھی منحرف ہونے والے نہیں۔ ان ہی لوگوں نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ ان ہی رنگے ہوئے سیاروں کے باعث باپ کو اپنے بیٹے سے الگ ہونا پڑا۔ جب تک کنجیاں رام ناتھ کے باپ کے ہاتھ میں رہیں۔ تب تک رام ناتھ اپنی مرضی کے موافق پیسہ خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دوست احباب بھی اس سے کچھ فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے لہذا ان لوگوں نے اُس کو ایسا سبق پڑھایا جس پر عمل کر کے رام ناتھ

اپنے باپ سے الگ ہوگیا۔ باپ نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی مگر اس کا رام ناتھ کے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ آخر باپ نے یہی سوچا کہ مجھے کیا پڑی ہے؟۔ جب ٹھوکریں کھائیگا۔ تب خود ہی ہوش میں آجائیگا۔ آخر انہوں نے اپنے بیٹے کو آدھی جائداد بانٹ دی۔ رام ناتھ اسی گاؤں میں کرایہ پر ایک مکان لیکر اپنے دن گذارنے لگا۔

اس کا باپ تجربہ کار بہر دور اندیش تھا۔ خواب میں بھی اس کا یہ خیال نہ تھا۔ کہ رام ناتھ اپنی باقی نصف جائداد حفاظت سے رکھیگا۔ اس لئے انہوں نے بنک میں جو نقد پچاس ہزار روپیہ پوشیدہ طور پر جمع کر رکھے تھے۔ اس میں سے انہوں نے اپنے لڑکے کو کچھ بھی حصہ نہیں دیا۔ ان نقد روپوں کا راز رام ناتھ کو معلوم ہی نہ تھا۔

رام ناتھ کے حصے میں پچیس ایکڑ تر زمین آئی تھی۔ آزادی مل گئی۔ باپ کی نصیحت اب سننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اسے اور کیا چاہئے؟۔

زمانے کا چکر گھومنے لگا۔ ادہر رام ناتھ رفتہ رفتہ ایک ایک ایکڑ فروخت کرنے لگا باپ اپنے لڑکے کے فعلوں کو دیکھ ہی رہا تھا اس کے لڑکے نے جو زمین فروخت کر ڈالی وہ اپنے ایک دوست کے وسیلہ سے نقد روپیہ ادا کر خود خرید لیا کرتا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنی جدی جائداد دوسروں کے ہاتھ میں جانے ہی نہ دی۔ وہ بات رام ناتھ کو معلوم ہی نہ ہوئی۔ نہ صرف اسے ہی بلکہ اور کسی کو بھی معلوم نہ ہوئی۔ رام ناتھ کے باپ کے دل میں یہ ذرا بھی خیال نہیں تھا کہ آگے چل کر جب رام ناتھ بالکل غریب ہو جائیگا۔ تکلیف اٹھاتے ہوئے دانے دانے کے لئے ترسیگا اور آخر میرے قدموں پر آکر گریگا تو یہ خریدی ہوئی زمین اسے واپس کر دی جائے گی لیکن

پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ یہ زمین بالا کے نام لکھ دی جائے تاکہ پھر رام ناتھ اسے فروخت ہی نہ کر سکے۔ اور اس طرح کسی قسم کی تکلیف اٹھائے بغیر گھر کا خرچ چلتا رہے۔

اس طرح ساس سسر کی نظروں میں توقیر حاصل کرنے والی خاتون دنیا میں شاید ہی کوئی ہو گی۔ یہی نہیں۔ جواری ہوتے ہوئے بھی رام ناتھ بالا کے نیک اوصاف سے متاثر ہو کر اس کو اپنے چرن کملوں کی پوجا کرنے کی اجازت دیتا تھا رام ناتھ کے دل میں اس کو ایک اعلیٰ اور قابل فخر جگہ حاصل تھی۔ اس کے آگے وہ اپنے بُرے افعال کے لئے افسوس کرتا اور پچھتاتا تھا۔ بالا کی آنکھوں میں نہاں پاکیزہ جلال کے باعث ہی اس کو تباہ و برباد کرنے والے تاش کے کھیل پر اُسے نفرت پیدا ہو گئی تھی۔

× × × ×

× × × ×

بالا نے چادر جھاڑتے ہوئے بچھونے پر بچھا کر دروازے کے پاس کھڑے رام ناتھ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر فوراً مسرت کی لہر دوڑ آئی۔ پوچھا "کیا سو جائیگا؟"

"ابھی نیند آ رہی ہے"

اس نے کہا "بالا! ہم ــــــ اس کے سوا اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ کچھ دیر تک اس کو اور غور سے دیکھ کر اس نے اپنا منہ موڑ لیا بالا بچھونے کو ویسے ہی چھوڑ کر اس کے سامنے آئی۔ کہنے لگی "کیا کچھ طبیعت علیل ہے"

رام ناتھ چپ چاپ اندر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بالا اس کے پاؤں کے پاس بیٹھ، سر اُٹھا کر اپنے شوہر کی طرف اِشتیاق کی نگاہ سے دیکھنے لگی۔

لاچار وہ ایک شرمناک بُرے کام کرنے کی رغبت سے منہ لٹکا کر بزدل گُناہگار کی مانند کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا حتیٰ کہ اس کمرے کے اندر ہوا کی حرکت بھی بند ہو گئی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد رام ناتھ نے کہا "بالا! کیا تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں"۔

بالا نے عاجزی سے شیریں الفاظ میں کہا "نہیں تو! — ایک آنہ تھا اس کا ابھی نمک خرید لیا۔ بتائیے آپ کو کتنا چاہیئے؟

رام ناتھ نے اس وقت کچھ جواب نہ دیا۔ آخر بولا "بالا! آج میرا دل پھر کھیل پر بری طرح مائل ہے"۔

ایک ماہ پیشتر رام ناتھ نے تاش نہ کھیلنے کا جو عہد کیا تھا اس کی اسے یاد آگئی آج پھر اپنے شوہر کے بے قابو دل کی یہ حرکت دیکھ کر بالا بہت دکھی ہوئی۔ مگر اس نے کبھی اپنے شوہر کی بات نہیں ٹالی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو نصیحت بھی کبھی نہیں کرتی تھی۔ درحقیقت اس نے کبھی تاش کے کھیل سے اپنے شوہر کا دل ہٹانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ آخر وہ سنجیدہ الفاظ میں بولی "میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ کیا کیا جائے؟"

تب رام ناتھ نے اپنی جادو بھری انگلیوں کے سہارے بالا کے سر کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "بالا" اس کے بعد اس کا گلا بھر آیا۔ اپنی بیوی کے گلے کی طرف

غور سے دیکھتے ہوئے۔ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

بالا رام ناتھ کی آنکھوں کے پنہاں ارادوں کو تاڑ گئی۔ اسے صاف طور سے معلوم ہو گیا کہ میرا یہ سہاگ کا دھاگہ جو باقی رہ گیا ہے۔ اس کو میرا شوہر اب جوئے میں ہار دینے کے بغیر دم نہ لیگا۔ اور جب تک یہ میرے گلے میں رہیگا۔ تب تک میرے شوہر کے دل میں جوئے سے نفرت پیدا ہونا ناممکن ہے۔ اس کا دل اسے مجبور کر رہا تھا۔ کہ وہ اسے بھی شوہر کے حوالے کر دے۔

بالا فوراً اُٹھ کر اندر گئی۔ ایک دھاگہ کو ہلدی کا رنگ لگا کر اس کے درمیان سیندور کی پوٹلی باندھ لائی۔ اسے اپنے شوہر کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔ یہ میرے گلے میں باندھ کر اسے بھی لیتے جائیے۔

جن ہاتھوں نے بڑے بوڑھوں کی دعا لیتے ہوئے بالا کے گلے میں یہ سہاگ کا دھاگہ باندھا تھا۔ آج وہ ہی ہاتھ جوئے کی زبردست خواہش کے باعث اسی سہاگ کے دھاگے کی گانٹھ کھولنے کے لئے بے صبر ہوتے ہوئے شرم اور ہیچ پن محسوس کرنے لگے۔ مگر تاش کی بُری عادت اسے اپنی اُنگلی کے اشارے پر نچا رہی تھی۔ آخر رام ناتھ دروازے سے باہر ہو گیا۔

اپنے گلے سے تمام زیورات اپنے شوہر کے حوالے کرتے وقت بھی بالا کے خوبصورت چہرے پر رنج کی لکیر تک دکھائی نہ دی۔ مگر آج اسے دکھ محسوس ہونے لگا۔ اس کا تکیہ رات بھر آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ شادی خانہ آبادی کے موقع پر وواہ منڈپ میں جب وہ اپنی آئندہ زندگی کے شیریں ارادوں کو دل میں لئے بیٹھی تھی۔ تب شرم کے مارے گلاب کی مانند اس کے رخساروں پر سُرخی دوڑ

آئی تھی۔ اس کے شوہر نے اپنے ہاتھوں سے اس کے گلے میں تین بار گانٹھ دیکر جو پاک سہاگ کا دھاگہ باندھ دیا تھا اور اتنے دنوں سے وہ ہلدی اور پھولوں کے ساتھ جس کی پوجا کرتی آرہی تھی آج وہ سہاگ کا دھاگہ کہاں چلا گیا؟ کیا پھر اسے وہ حاصل کر سکے گی؟۔ اسے پہننے کا دوبارہ موقع نصیب ہوگا؟

شوہر کی جائداد۔ گھر کا سامان۔ اپنے زیورات۔ سب کچھ کھو جانے پر بھی وہ کبھی اتنی پریشان نہ ہوئی تھی۔ صرف اپنے سہاگ کے دھاگہ کے چلے جانے سے اس نے اس رات نہ جانے کتنا دکھ محسوس کیا۔

(۳)

پو پھٹنے لگی۔ تاریکی کا پردہ ایک کے بعد دوسرا ٹوٹنے لگا۔ کلب میں کھیل ختم ہو گیا۔ رام ناتھ گھر آرہا تھا۔

اس رات کے کھیل میں رام ناتھ کو عجیب و غریب فتح حاصل ہوئی۔ جیت میں ویسی پوری کامیابی اسے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اس نے پہلے ہی کھیل میں شگون کے ہار کی بازی لگائی۔ اسے فتح نصیب ہوئی۔ رات بھر کھیلتے کھیلتے وہ صرف چار پانچ مرتبہ ہارا تھا۔ کوئی بھی یہ کہہ نہیں سکتا کہ یہ جادو شگون کے ہار میں ہے یا اور کسی میں۔

اب وہ تقریباً پچیس ہزار نقد روپیوں کے ساتھ گھر واپس آرہا تھا۔ پہلے تاش کے کھیل میں۔ اس نے جو جائداد گنوائی تھی۔ اس کی تمام قیمت آج ایک رات میں ہی اسے واپس مل گئی۔

مگر رام ناتھ کے چہرے پر خوشنودی کے آثار دکھائی نہیں پڑتے تھے۔

جوئے میں ہارنے والوں کے رنج سے وہ خوب واقف تھا۔ اسے آج معلوم ہوا کہ دوسروں کی دولت کو جوئے میں جیتنا میرے جیسے انسانوں کے لئے خوشی کی بات نہیں ہے۔ انصاف اور ہمت کے بغیر بُرے کاموں سے جو زر حاصل ہوتا ہے۔ اسے لیتے ہوئے کس کا دل نہیں ہچکچاتا۔ آخر اس زر کا تصرف کس طرح کیا جائے۔

پہلے کھیل سے نکلتے وقت وہ اپنے دل کو سنبھال نہ سکا۔ جیت کے بعد بھی اس کا دل خوش نہ تھا۔ وہ اپنے دل کی اس عجیب حالت پر خود ہی حیران ہو رہا تھا۔ جب جیتنے کی خوشی نہیں ہے۔ تو کھیل کیطرف اس کی اتنی رغبت کیوں؟

رات کو جب رام ناتھ جوا کھیلنے گیا تھا۔ تب بالا کو دروازہ بند کرنے کی سُدھ ہی نہ رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی رام ناتھ دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا۔ ایشور بہ ہی جانے تب تک بالا کن خیالات میں محو تھی۔

شوہر کے پاؤں کی آہٹ سن کر وہ پلنگ پر سے اٹھ کر اس کے گھٹنوں سے لپٹ گئی۔ سر اُٹھا کر ملتجیانہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی " ناتھ! لائے میرا سہاگ کا دھاگہ۔

بالا پہلے کبھی اس طرح ڈانواں ڈول نہیں ہوئی تھی۔ رام ناتھ کو یہ معلوم تھا ایک تو اسے رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ دوسرے رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں [illegible] کی یہ شکل دیکھتے ہوئے اسے ایسا جان پڑتا تھا کہ گویا رنج کی دیوی اس کے سامنے کھڑی ہے۔ یہ دیکھ کر رام ناتھ کا دل بھر آیا۔ اسے بالا پر رحم آ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آنسو بالا کے جسم پہ ٹپکنے لگے۔

بالا کے دل کی سادگی اور صاف و شفاف محبت نے رام ناتھ کو چاروں طرف سے گھیر کر اُسے شکست دے دی۔ کتابوں کی دلیلیں۔ اور باپ کی نصیحت بھی جب اس کے دل کو پلٹا نہ سکیں تو وہ کام ان ملتجی آنکھوں نے کر دکھایا۔

بالا اپنے شوہر کے لئے سب کچھ نذر کر اسے خوش رکھنے کے لئے ہزاروں تکلیفیں سہنے والی صابر خاتون تھی۔ رام ناتھ تو ایسا خود غرض انسان تھا جو اپنی بُری عادات سے مجبور ہو کر اپنی بیوی کا سہاگ کا دھاگہ بھی بازی لگانے پر مجبور ہو گیا۔ اور اس نے اس کام میں کچھ بھی نہ سوچا دونوں کے درمیان جو خلیج واقع تھی اسے عبور کر رام ناتھ نے خود کو بالا کے نزدیک سے جانے کی ضرورت محسوس کر لی۔ اس نے اپنے پاؤں کے پاس بیٹھی ہوئی بالا کو آہستگی سے اوپر اٹھایا۔ سہاگ کا دھاگہ جیب سے نکال کر اس کے گلے میں باندھ دیا۔ صبح کے وقت نمودار ہوتے ہوئے آفتاب کی شعاعوں کی مانند بالا کا چہرہ خوشی سے تمتما اُٹھا۔ سہاگ کے دھاگہ کو اپنے مذہبی عقیدہ کے مطابق اس نے سر آنکھوں سے لگایا اب اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

(۴)

دوسرے دن رام ناتھ نے گذشتہ رات کے کھیل میں ہارے ہوئے دوستوں کو بلا کر انہیں ان کا روپیہ واپس کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ ان سے آئندہ تاش کبھی نہ کھیلنے کی قسم بھی کھلائی۔ اس کی اس اچانک تبدیلی پر گاؤں کے لوگ جامہ میں پھولے نہ سمائے۔ اور بالا کے پاک چلن کو ہی اس کا باعث تصور کرنے لگے۔ رام ناتھ کے باپ کو از حد خوشی ہوئی۔ اسی دن انہوں نے

اپنی بہو نیز بیٹے کو اپنے یہاں بلا کر جشن منایا۔ بالا نے اپنی ساس کی چھاتی کو مسرت کے آنسوؤں سے بھگو دیا۔

جیسا کہ پہلے رام ناتھ کے باپ نے سوچا تھا۔ انہیں اب بالا کے نام جائداد لکھنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

خط اور آنسو

(تامل زبان سے ترجمہ)

(۱)

مشہور و معروف گرلنر سکول کی بانی اور ہیڈ استانی بہن ان پورنا دیوی اپنے روزانہ دستور کے مطابق ایک دن شام کو گرلنر سکول کے باغیچہ میں جو گرلنر سکول کو چاروں اطراف سے گھیرے ہوئے تھا۔ ٹہل رہی تھیں گرلنر سکول سے کچھ دور فاصلہ پہ ایک بنگلہ میں شہنائی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جس سے ان کو پرانی باتیں یاد آگئیں۔ ان کے چہرے پر جہاں ہمیشہ اطمینان کی لہر جھلکتی رہتی تھی۔ ایک ہی لمحہ میں پریشانی چھا گئی اور دوسرے ہی لمحہ وہ غائب ہو گئی اسی طرح جیسے خاموش پرسکون سمندر میں اچانک ایک بڑی بھاری لہر اٹھ کر کسی چٹان سے ٹکراتی ہے اور پھر غائب ہو جاتی ہے۔ لہر اٹھنے

کے بعد۔ بطور یادگار جس طرح اس چٹان کے گڑھوں میں پانی باقی رہ جاتا ہے ویسے ہی ان پورنا دیوی کی آنکھوں میں بھی آنسو چھل چھلا رہے تھے۔

اسی راستہ میں گرلنر سکول کی استانی شریمتی ساوتری ایم۔اے۔ایل ٹی کو سامنے آتے دیکھ کر ان پورنا دیوی نے فوراً آنسو پونچھ لئے۔ اور خندہ پیشانی کے ساتھ ساوتری کا استقبال کیا۔ دونوں نزدیک ہی نیم کے درخت کے نیچے بنے ایک چبوترے پر بیٹھ گئیں۔

× × × × ×

× × × × ×

لڑکیوں کی خدمت میں ہی اگر کسی کے بال پک گئے ہیں تو وہ بات ان پورنا دیوی پر عین صادق آتی ہے۔ ان کی کھوپڑی کو ڈھکنے والے بے تحاشہ بڑھے ہوئے سفید بالوں کو دیکھتے ہی پہاڑ کی چوٹیوں پر قطارہ باندھ کر چھائے ہوئے بادلوں کا نظارہ لوح دماغ پر نقش ہو جاتا تھا۔ بالوں کے اس طرح پک جانے پر بھی ان کے چہرے کو بغور دیکھنے پر یہ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔ کہ ان کی عمر پچاس برس سے اوپر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا انہوں نے... جوبن کے رائتوں کو ڈھونڈھ نکالا ہے۔ سفید ساڑھی۔ سفید بالوں والے سر اور ہر طرح سے مطمئن صاف شفاف چہرے والی بہن ان پورنا دیوی کو دیکھنے والے انہیں سرسوتی کا اوتار ہی سمجھتے تھے۔

ان پورنا دیوی کی داستان حیات مشہور ہی نہیں بلکہ تمام لوگوں کو معلوم تھی۔ اپنے نو برس کی عمر میں ہوش سنبھالنے سے پیشتر ہی۔ اپنے شوہر کا سایہ

سر سے اٹھ جانے کے باعث بدقسمتی سے بیوگی کا شکار ہو جانا ان کی قسمت میں لکھا تھا۔ ان کی وہ بدقسمتی استری سماج کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ بعد کے دنوں میں۔ انہوں نے پڑھ کر بی۔ اے ایل ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ تب سے وہ بیواؤں شوہروں کے گھر سے نکالی ہوئی طلاق شدہ مستورات۔ یتیم لڑکیوں وغیرہ کی خدمت میں ہی اپنی زندگی گذارنے لگیں۔ اپنے زندگی کے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی غرض سے اسکو اپنے زندگی کے مقصد کا ایک ذریعہ سمجھ کر انہوں نے اس گرلنز سکول کی بنا ڈالی تھی۔ اور اپنا تن من۔ دھن سب کچھ اسی کی نذر کر دیا تھا۔

نائب اُستانی شریمتی ساوتری دیوی ابھی جوان عمر کی تھی۔ اس کی عمر لگ بھگ پچیس کے قریب ہوگی۔ اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ تین سال پہلے ایم۔ اے ایل ٹی کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد جب اس نے اس گرلنز سکول میں بطور نائب استانی کام کرنا شروع کیا تھا۔ تب اگرچہ اس کا دلی ارادہ گرلنز سکول میں بلا تنخواہ کام کرنے کا نہ تھا۔ مگر بعد میں بہن ان پورنا دیوی کی صحبت میں رہ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور وہ گرلنز سکول میں بلا تنخواہ لئے کام کرنے لگیں۔ کبھی کبھی اس نے یہاں تک سوچا کہ ان پورنا ہی کی طرح میں بھی کیوں نہ استری سماج کے لئے اپنی زندگی نذر کر دوں۔

× × × ×

× × × ×

ساوتری نے کہا "بہن جی! آج شاعری کا سبق پڑھاتے

وقت مجھے بہت پریشان ہونا پڑا۔ محبت سے ہی دنیا چلتی ہے۔ ایسا ایک مصرع
اس میں تھا۔ پدما نے پوچھا "شاعر کس محبت کا یہاں ذکر کرتے ہیں" بڑی
نٹ کھٹ لڑکی ہے پدما! ...... "سنیئے اسی کی مسکراہٹ گونج رہی ہے"
باغ کے دوسری جانب کچھ لڑکیاں ہاتھ سے گیند کھیل رہی تھیں۔ وہیں سے
ایک قہقہہ اٹھا۔ جس کی گونج جنوبی ہوا میں لہراتی ہوئی آ رہی تھی۔

"پدما کے سوال کا تم نے کیا جواب دیا" ان پورنا نے پوچھا۔

جواب دینے میں میں بہت ہچکچائی۔ شاعر یہاں جس محبت کا ذکر کرتے
ہیں۔ اس سے ان کا مطلب عورت مرد کے پیار سے ہے۔ لیکن یہ بات میں
ان لڑکیوں کے سامنے کیسے کہتی۔ عام لڑکیوں کو سمجھانا بھی مشکل ہے۔ جب
میں میریز کالج میں پڑھا کرتی تھی۔ تب میری استانیوں پر جو گذرا کرتی تھی۔ وہ
مجھے بخوبی یاد ہے۔ یہاں تو تمام عورتیں بیوائیں یا طلاق شدہ ہیں ——
ان کے سامنے میں محبت کے بارے میں کہوں تو کیا کہوں ——

اس طرح ساوتری کہتی جا رہی تھی کہ درمیان میں اس نے بولنا فوراً
بند کر دیا۔ اسے اچانک یہ بات یاد آ گئی کہ بہن ان پورنا دیوی بھی تو اوائل عمر
میں بیوہ ہو چکی ہیں۔ اور اس کے دل میں کھٹکا کہ شائد اس نے دوران
گفتگو میں کوئی ایسے نا واجب الفاظ زبان سے نہ نکال دیئے ہوں اس
خیال سے اس نے بات بدلتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ سچ پوچھو
تو بہن جی یہ سب بالکل پاگل پن معلوم ہوتا ہے۔ محبت۔ عشق سب
بالکل بھرم ہی ہے نہ ؟ ۔ بے کار شاعروں کی بکواس کے سوا یہ

اور کچھ نہیں۔

تب ان پورنا دیوی نے کہا "اچھا یہ بات ہے۔ سب بھرم ہے بہت ٹھیک۔ میں ڈاکٹر سری نواس کو ویسا ہی لکھ دیتی ہوں"

ساوتری کی ڈاکٹر سری نواس کے ساتھ شادی ہونے والی تھی۔ اس بات کی طرف ہی ان پورنا کا اشارہ تھا۔ ساوتری نے حیا آمیز ہنسی ہنس کر کہا" ہاں تو کون جانے ہے۔ آج جو بات سچی معلوم ہوتی ہے۔ دو سال بعد۔ یہ کسی کو کیا معلوم کہ وہ کیا ہو گی۔ ان باتوں کو جانے دیجئے بہن! شاعر جو یہ کہتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی بڑا کام محبت سے ہی ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ ہی تو ہے۔" یہ درست کیسے ہو سکتا ہے اس گرلز سکول کو ہی لیجئے۔ جو پچیس سال سے چل رہا ہے۔ اس کماری سے لیکر کشمیر تک ایسا کوئی نہیں جو اس کی تعریف نہ کرتا ہو۔ ایسا بھی کوئی نہیں جو آپ کی خدمت گذاری کی تعریف نہ کرتا ہو۔ اس بیوا سدن کے بارے میں شاعر کی یہ دلیل کیسے درست ہو سکتی ہے۔

" ساوتری! دنیا کے اور بڑے سے بڑے کاموں کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتی۔ شاعر کی بات ان سب کے بارے میں درست ثابت ہوتی ہے کہ نہیں۔ وہ میں نہیں جانتی لیکن اگر میری خدمت کو ایک اہم کام تصور کیا جائے تو اس کے بارے میں شاعر کا قول درست ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ میری کوششوں کا اصلی سبب محبت ہی تھا۔

" نہیں۔ کون کہتا ہے تیموں اور محتاجوں سے آپ کی محبت تو مسلمہ ہے"

اس محبت کے بارے میں میں نہیں کہتی۔ میں تو شاعر کی تحریر کردہ محبت کو ہی کہتی ہوں۔ اگر میں نے کوئی خدمت کی ہے تو وہ سب پیار کے بیج سے ہی پیدا ہوئی ہوئی ہے۔

ساوتری کو یہ سن کر تعجب ہوا۔ اس نے حلیمی سے پوچھا۔ بہن! کیا یہ بات درست ہے؟ کیا آپ سچ کہتی ہیں۔ اگر جواب ہاں میں ہو تو تمام باتیں میرے گوش گذار کیجئے۔

(۲)

ان پورنا دیوی نے کہا۔

شادی والے گھر سے جو شہنائی کی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی آرہی ہے۔ سنتی ہو نہ؟ ۔ شہنائی پر کیدار راگی۔ شادی کے راگ کو کیسے عجیب ڈھنگ سے گا رہا ہے۔ تمہیں دیکھنے سے ایک لمحہ پہلے۔ جب وہ آواز میرے کانوں میں پڑی تب مجھے اپنے بچپن کی تمام باتیں یاد آگئیں۔ جن آنکھوں میں ایک طویل مدت سے آنسو نہیں آئے تھے۔ ان آنکھوں سے بھی آنسو نکل ہی پڑے۔ کئی سال پہلے ایک شادی کے وقت اسی راگ کو شمبھو نارکویل کا ہم ہوئی گارہا تھا۔ اس زمانے میں شہنائی بجانے والوں میں اسی کا نام مشہور تھا۔

یہ تمام باتیں آپ کو اب تک یاد کیسے ہیں بہن جی! میں نے تو سنا تھا۔ کہ آپ کی شادی بالکل بچپن میں ہوئی تھی۔

میں اپنی شادی کے بارے میں نہیں کہتی۔ کہتے ہیں۔ کہ جب میری عمر چھ سال کی تھی تب میری شادی ہوگئی تھی۔ نو برس کی عمر میں میں بیوہ

ہوگئی۔ وہ تمام باتیں مجھے صاف طور سے تو نہیں۔ مگر خواب کی طرح کچھ کچھ یاد ہیں۔ اتنی چھوٹی عمر میں بیوہ ہونے میں ایک سہولیت بھی تھی۔ ارے تم تو ہنس رہی ہو۔ سچ مچ بات ویسی ہی ہے۔ اور اگر چار پانچ سال بعد میں ہوتی تو اور سب لوگوں کی طرح میرا بھی سر منڈاتے اور میری دُرگتی کرتے۔ تب لوگوں نے مجھے بغیر کچھ کئے ہی چھوڑ دیا۔

میں اپنی چچا زاد ہمشیرہ کی شادی کا ذکر کر رہی ہوں۔ انوجم مجھ سے عمر میں دو سال چھوٹی تھی۔ اس کی شادی کے وقت میری عمر سولہ سال کی ہوگی۔ انوجم مجھے دل سے چاہتی تھی۔ جب سے میں بیوہ ہوئی۔ تب سے چاچی کے گھر میں ہی رہنے لگی تھی۔ میری بدقسمتی دیکھ کر کے تمام لوگ مجھ سے پیار کرتے تھے۔ گھر کے تمام کام۔ کاج میری ہی رائے سے چلتے تھے۔

انوجم کی شادی جب طے ہوگئی تب میری ہی مرضی کے مطابق تمام کام کئے گئے داماد کے لئے کیسی دھوتی خریدی جائے۔ کس شہنائی والے کا بندوبست کیا جائے (کچھ سال پہلے اعلےٰ خاندان کے مدراسیوں کے ہاں یہ رواج تھا۔ کہ وہ برات کو پانچ دن ٹھہراتے۔ اور کھانا کھلاتے تھے۔ مگر ان دنوں تو شادی کی رسم ایک دن میں ہی پوری ہو جاتی ہے) براتیوں کے لئے کون کون سی مٹھائی تیار کی جائے۔ ایسی تمام باتیں میرے ہی صلاح مشورہ سے طے کی گئیں۔

شادی کی پہلی شب کو داماد کو بلا کر لگن وغیرہ کا فیصلہ کیا گیا۔ گھر کی مستورات میں میں بھی شامل تھی۔ چوکی پر بیٹھی ہوئی انوجم کے سر سے جواہرات

سے مرجع جو ہزار تن کھسک پڑا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھوڑی دیر میں نیچے گر پڑیگا۔ میں اس کے پاس گئی۔ اور اسے درست طور پر لگا کر میں نے سر اٹھایا تو دیکھتی ہوں کہ داماد کے پاس ہی بیٹھے ہوئے ایک نوجوان مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔

اسی لمحہ میرا تمام بدن لرز اٹھا۔ سر جھکا لیا۔ اس خوف سے کہ کہیں میں بیہوش ہوکر زمین پر نہ گر پڑوں۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کام میں مصروف ہوگئی۔ یہ میری خوش قسمتی سمجھئے کہ ایسا کوئی واقعہ نہ ہوا۔

ان کے چہرے کی طرف دیکھنے کی پھر میرے دل میں ایک زبردست خواہش پیدا ہوگئی۔ میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ میرے دل میں ایسی بھی کوئی خواہش پیدا ہوسکتی ہے۔ میں نے حتے الامکان دل کو اپنے قابو میں لانے کی کوشش کی۔ اور اپنی خواہش کو جہاں تک میری طاقت میں تھا۔ دبایا۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر جب میں نے ان کی جانب غور سے دیکھا تب انہوں نے بھی مجھے دیکھنے کے بعد سر دوسری طرف پھیر لیا۔

دوسرے دن انبوجم کی شادی شان وشوکت سے ہوگئی۔ باہر سے تو ہمیشہ کی طرح اپنے کاموں کو دیکھتی بھالتی تھی۔ مگر میرا دل کسی نرالی ہی دنیا میں گھومنے لگ گیا تھا۔

شادی کے روز رہا سہا شک بھی دور ہوگیا۔ انہوں نے مجھے یوں ہی اتفاقاً نہیں مرضی سے دیکھا تھا۔ میرے دل کی حالت بھی اب کچھ درست ہو چلی تھی۔ بجلی کی مانند وہ کوئی طاقت تھی جس نے مجھے ان کی طرف کھینچا۔ یہ میں جان گئی۔

دیکھتی ہو وہ جو آسمان پر ماہ کامل نکل رہا ہے۔

جب بہن ان پورنا دیوی نے اس طرح سوال کیا تب ساوتری نے چاند کی طرف دیکھا۔

ماہ کامل کو اس سے پیشتر میں نے کئی بار دیکھا تھا۔ لیکن انو جم کی شادی کے وقت میں نے جو خوبصورتی "ماہ کامل" میں دیکھی۔ وہ اس سے پہلے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ شہنائی کی شیریں آواز اس سے پیشتر مجھے اس طرح مست نہ کر سکی۔ چندن کی مہک اور چنبیلی کی خوشبو سے میں پہلے کبھی بھی اتنی مسرور نہیں ہوئی۔ جتنی اس دن ہوئی۔

میرے دل میں وہ تمام امیدیں پیدا ہوئیں جو اس سے پیشتر کبھی پیدا نہ ہوئی تھیں۔ میں سوچنے لگی۔ اور سب لڑکیوں کی طرح میں بھی بال سنوار کر پھول کیوں نہیں رکھ سکتی۔ سیندور سے مانگ کیوں نہیں بھر سکتی۔ چندن کیوں نہیں لگا سکتی۔

شادی کے تیسرے دن میں انو جم کے ساتھ اس کے میکے گئی۔ انو جم کی نند ابھی تک بال سنوار رہی تھی۔ اس کے پاس اب کون کون سے زیورات ہیں۔ اب وہ کون کون سے بڑھیا کپڑے پہننے والی ہیں۔ ایسی قیمتی باتوں کے بارے میں وہ دریافت کر رہی تھیں۔ میرا دھیان اس طرف نہ تھا۔ ہال میں دو چار اشخاص آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ اور بیچ بیچ میں کچھ الفاظ سنائی پڑتے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ ان ہی کی آواز ہے۔ میں کان لگا کر غور سے سننے لگی۔ اس آواز میں کیسی شیرینی اور کیسی خود غرضی بھری ہوئی تھی۔ بچپن میں

ہونے والی بیواؤں کی حالت کے بارے میں ہی وہ بات چیت کر رہے تھے۔ وہ بیوگی کی سختیوں کے بارے میں کتنے ہی معزز ہستیوں کی دلیلیں پیش کرتے گئے اور کتابوں کا بھی ذکر کیا۔ ان مثالوں میں سے انہوں نے شری مادھویہ کی تحریر کردہ کہانی کا ذکر کیا اور کہنے لگے اس کہانی کو ضرور پڑھئے اس کے پڑھنے سے آپکو معلوم ہوگا کہ بچپن کی شادی کرنے سے کیا کیا نقصان ہیں۔ اور بیوگان کی شادی کیوں کرنی چاہیئے۔ ان کے یہ الفاظ تو مجھے اب بھی یاد ہیں۔

ایک نے کہا۔ ٹھیک بولتے ہو صاحب! باتیں بگھارنے میں تو تم پورے استاد ہو۔ تب ان پورنا دیوی کے ساتھ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟

انہوں نے جواب دیا۔ چھی! چھی!! تم لوگ بالکل نادان ہو۔ تم سے بات چیت کرنے کی نسبت ٹوٹی دیوار سے گفتگو کرنا ہزار درجہ بہتر ہے اس کے بعد اچانک کسی کے کمرے سے باہر جانے کی آہٹ سنائی دی۔

اتنے میں ان کے بارے میں تمام باتیں مجھے سمدھی کے گھر سے دوران گفتگو میں معلوم ہو گئیں۔ اس سال وہ صوبہ بھر میں بی۔ اے کے امتحان میں اول رہے تھے۔ لوگ ان کو جہیز میں پانچ ہزار روپیہ نقد دینے کو کہہ رہے تھے ایسے شخص کے ساتھ میری شادی ہو سکے گی۔ کیا یہ میری قسمت میں لکھا ہے کہ میں ایسے شخص کی رفیقہ حیات بنوں۔ میں ان باتوں پر اعتبار نہ کر سکی۔

(۳)

شادی کے چوتھے روز خبر آئی کہ سمدھن کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ ان کو دیکھنے کی غرض سے ان کے ہاں میں گئی۔ میں سوچتی جا رہی تھی۔ کہ وہ

شاید وہیں ہونگے۔ وہلیز عبور کر جب میں صحن میں پہنچی۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ صحن میں اکیلے ٹہل رہے ہیں۔ اور مجھے دیکھ کر پوچھا۔ کس کو ڈھونڈھ رہی ہو۔ میں کچھ جواب نہ دیکر صمٌ بکمٌ کھڑی ہوگئی۔ انہوں نے فوراً میرے ہاتھ میں ایک خط رکھ کر اسے میری ہی انگلیوں سے ڈھانپ دیا۔ تاکہ وہ باہر کسی کو دکھائی نہ پڑ سکے اس کے بعد وہ فوراً گھر سے باہر چلے گئے۔ میرا تمام جسم اس طرح کانپ اٹھا جس طرح آندھی سے پتے۔ لیکن میں نے مستقل مزاجی سے وہ خط حفاظت سے اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اور اندر چلی گئی۔ سمدھن سے باتیں کرتے وقت میری عقل اپنے ٹھکانے نہ تھی۔ سمدھن نے پوچھا۔ پوچھتی ہو میری طبیعت کیسی ہے ؟۔ تم کو کیا ہوگیا ہے۔ بیٹی ؟ آنکھ اور چہرے کے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔ ہاں! میرا ابھی سر درد کر رہا ہے۔ کہہ کر میں سیدھے گھر لوٹ آئی۔ آتے ہی اندر کے کمرے میں چٹائی بچھا کر لیٹ گئی۔ پوچھنے والوں سے طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کہہ کر سسک سسک کر روتی رہی۔ اس کے بعد مجھے ان کی زیارت نصیب نہیں ہوئی۔

کیوں بہن جی! بات کیا ہوئی ؟۔ اس خط میں آخر ولیا کیا لکھا تھا ؟

خط میں ؟ مجھ سے ان کو جتنی محبت تھی وہ انہوں نے سب ظاہر کر دی تھی انہوں نے لکھا تھا کہ میرے لئے کوئی بھی قربانی کرنے اور دنیا بھر کا سامنا کرنے کے لئے وہ تیار ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے مجبور کرنے یا دکھ پہنچانے کی ان کے دل میں کوئی خواہش نہیں خط میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ اگر مجھے بھی ان سے محبت ہے اور سماج کے ہنسی مذاق کا سامنا کرنے کی مجھ میں جرات بھی ہے۔ تو اس روز میں شام کو جلیبی کے وقت اپنے ہاتھ میں چمبیلی کا پھول رکھ کر کھڑی رہوں

روز میں پڑھنا جانتی ہی نہ تھی بے علم تھی۔

ساوتری کی آنکھوں سے چھل چھلاتی ہوئی آنسوؤں کی بوندیں۔ چاند کی شفاف چاندنی میں موتیوں کی طرح جھلکنے لگیں۔

اور اس وقت بھی وہ شہنائی والا کیدار گوڑ ہی راگ گا رہا تھا۔ اور شہنائی کے ذریعہ دنیا بھر میں مسرّت کی لہریں بہا رہا تھا۔

قربانی

(بنگالی سے ترجمہ)

منشی اشرفی لال ایک معمولی چنگی کی چوکی کے محرّر تھے۔ اور نہایت کشادہ دل انسان تھے۔ ان کی بڑی بڑی نشیلی آنکھوں کو سرمے کی کمی نہ تھی۔ اور نہ ہی ان کے گھونگر والے بالوں کو تیل کی حاجت ان کے باریک اور خوبصورت ہونٹوں کی قدرتی سرخی میں پان ہونے پہ سہاگے کا کام کرتا تھا۔ جب منشی جی دن بھر کی محنت کے بعد شام کے وقت بن سنور کر سیر کو نکلتے تو عطر کی خوشبو سے بازار کی فضا معطر ہو جاتی۔ گاؤں کی سادہ لوح عورتیں اپنے گھونگھٹ کی آڑ سے چنگی خانے کے اس بانکے چھبیلے کو ایک نظر ضرور دیکھ لیا کرتیں۔ منشی اشرفی لال بھی ان کے ان خاموش اور رمزیہ اشاروں سے ناواقف نہ تھے وہ بھی مسکرا کر بانکی ترچھی نظروں سے ان کی طرف دیکھنے سے نہ چوکتے۔ ان کے پہلو میں دل تھا اور دل میں شوخی تھی۔ رانی پور آنے سے پیشتر ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔

منشی جی نے اس صدمہ کو بہت محسوس کیا۔ ایسے موقعہ پر کون دکھ محسوس نہیں کرتا۔ البتہ کسی کو کم محسوس ہوتا ہے اور کسی کو زیادہ۔ کوئی اسے گلے کا ہار بنا لیتا ہے اور کوئی کچھ دن بعد بھول جاتا ہے۔ مگر ہوتا سب کو ہے۔ انسانی طبیعت میں شوخی اور بیقراری قدرتی امر ہے۔ ممکن ہے منشی اشرفی لال میں یہ اوصاف کچھ خاص شکل میں موجود ہوں۔ لیکن یہ تو ان کی زندگی کا زبردست ثبوت تھا۔ وہ نہایت ملنسار بھی تھے۔ دنیا میں وہ تنہا تھے۔ اور اگر اس تنہائی کی روح سوز تکالیف کو محسوس کر کے کسی کو اپنا بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ تو اس میں تعجب کی کیا بات تھی۔ انسان ہمیشہ دوسروں کی ہمدردی اور محبت کا خواہاں اور خواہشمند رہتا ہے۔ جہاں اس کی کمی ہوتی ہے وہاں زندگی روکھی پھیکی اور بے مزہ ہو جاتی ہے۔ ہماری اس حقیر زندگی کا ستون محبت ہے .... اسی محبت کی تلاش میں ہمارے منشی صاحب بھی چاروں طرف مارے مارے پھرتے تھے مگر چھ ماہ کی شب و روز بادیہ پیمائی کے باوجود بھی انہیں کہیں کامیابی کی جھلک دکھائی نہ دی۔ امید کی دیوی انہیں برابر حوصلہ دیتی جاتی تھی اور نگاہ کی آخری حد پر ایک خفیف جھلملاہٹ ان کے جذبات میں گدگدی پیدا کر دیتی تھی۔ یہ لطیف جلوہ گری سُکھیا کے رُخِ زیبا کی تھی۔ سُکھیا قوم کی کہار ن تھی۔ لیکن اس سے کیا۔ حسن کسی خاص قوم کی میراث نہیں ہوتا۔ وہ تو لامحدود ہے۔ کبھی کبھی غیر مہذب اقوام میں بھی حسن کا وہ دل کش پھول نظر آتا ہے۔ جس کی نکہت سے اطراف و جوانب معطر ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے سامنے مہذب قوموں کا پُر تکلف حسن بھی ماند پڑ جاتا ہے۔ اس کی ایک پنکھڑی پر ہزاروں نوشگفتہ

پھول نثار ہو جاتے ہیں۔ اور بیشمار شہد کے پیاسے بھونرے اس کے گرد و پیش منڈلانے لگتے ہیں۔

انہیں بھونروں میں سے ہمارے منشی اشرفی لال بھی تھے۔ وہ سکھیا کے ملاحت بار حسن پر سو جان سے فدا ہو گئے! وہ بنتے ٹھنتے تھے تو اسی کے لئے۔ اسی کے سادہ لوح خاوند کو نوکر رکھا تھا تو اسی کے لئے۔ کھیت کے مینڈ پر بیٹھ کر وہ اسی کے ہجر میں نہایت پُرسوز انداز سے برہا کی تانیں الاپتے تھے۔ تن تنہا کوٹھڑی کے کونے میں بیٹھ کر سرد آہیں بھرتے تھے۔ تو اسی کی یاد میں۔ اور اگر خوش ہوتے تھے تو اسی سے ملاپ کی امید کا آب حیات پی کر۔

وہ کوشش پر کوشش کرنے لگے۔ ہمدردی کے مکر و فریب کا جال بچھا کر اسے اپنے دام فریب میں پھنسانے کے لئے ہمارے دور اندیش منشی جی نے اس کے کھانے پینے کا انتظام بھی خود ہی کر دیا۔ تاکہ اسی بہانے کبھی کبھی اس سے تنہائی میں گفتگو کرنے کا انہیں موقعہ ہاتھ لگ جائے۔ یوں تو روزانہ وہ کچھ کام کرنے یا کھانا لینے آتی ہی تھی۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا تھا۔ کہ کھانا پکانے میں مدد دینے کے حیلہ سے وہ روک بھی لی جاتی تھی۔ ایسے موقعوں پر سکھیا کو گھنٹہ یا آدھ ان کے پاس اکیلے ٹھہرنا پڑتا تھا۔

ایک دن سکھیا چولہے کے باہر بیٹھی روٹی بیل رہی تھی۔ منشی جی توے پر روٹی ڈال کر اس سے کہنے لگے۔ سکھیا تیری دھوتی بہت میلی ہو گئی ہے فدا صاف کپڑے پہن کر روٹی بنانے آیا کر۔

سکھیا نے جواب دیا۔ منشی جی! میرے پاس اتنے کپڑے کہاں

جو میں ہر روز صاف دھوتی پہن کر آیا کروں میرے پاس تو گنتی کی دو دھوتیاں ہیں ان میں سے بھی ایک پھٹ گئی۔

منشی جی نے کہا "تو مجھ سے اب تک کیوں نہیں کہا۔ میں نئی دھوتی لا دیتا کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ آج جانے سے پہلے مجھ سے میری نئی دھوتی لیتے جانا پھر دو پوری آ جائے گی۔"

سُکھیا نے احسان مند نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ منشی جی بھی نہ معلوم کیسے کیسے دلسوز تصورات کی لہروں میں تیرنے لگے۔ مسکراتے ہوئے تشنہ کام نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں توے پر پڑی ہوئی روٹی کا خیال بھی نہ آیا۔ سُکھیا روٹی کو جلتے دیکھ کر ہنس پڑی۔ اس نے کہا "منشی جی! اب ذرا روٹی کی طرف خیال کرو۔ میں کہیں بھاگی تو نہیں جاتی ہوں مجھے پھر دیکھ لینا۔"

منشی جی نے شرم سے آنکھیں نیچی کر لیں۔ اور کہنے لگے "سُکھیا! تو بہت شوخ ہوتی جاتی ہے۔"

اسکے جواب میں سُکھیا ہنس پڑی۔

منشی جی بھی ہنسنے لگے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے پھر کہا "سُکھیا! تجھے تو کسی بڑے گھر کی مالکہ بننا چاہیئے۔ سُکھیا نے ہنس کر کہا "یہی تو میں بھی سوچتی ہوں۔"

منشی جی نے جواب دیا "تو ہو جاؤ نہ۔"

اتنا کہہ کر انہوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ لیکن سُکھیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ نہایت متانت اور سنجیدگی سے نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی؟ پھر اس دن اس نے کوئی بات چیت نہ کی۔

(۲)

کچھ دن بعد سُکھیا کے طرزِ عمل میں کچھ تبدیلی کی جھلک نظر آنے لگی۔ ادھر منشی جی کے دل میں بھی راحت و مسرت موجزن ہوگئی۔ مایوسی کی گھنگھور تاریکی میں امید کی نورانی شعاعیں جلوہ ریز ہونے لگیں۔

ہمدردی نے خواہشات اور پُرشوق جذبات کو چھپا کر ایسا خطرناک جال بچھا رکھا تھا کہ اس میں سادہ لوح نازنین پھنس ہی جاتی تھیں۔ دنیا میں ایسے کتنے جلیل القدر اشخاص اور جانباز عورتیں ہونگی جو مالی مشکلات کے وقت دولت کے پھیلے ہوئے خوشنما جال سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں۔ اور پھر جب محبت کا دانہ بھی پھینکا جا رہا ہو اسوقت تو بچنا محال ہے!

وہ سُکھیا جو پہلے منشی جی کے پاس زیادہ دیر تک ٹھہرنے میں جھجھک محسوس کرتی تھی۔ اب دو چار گھنٹے وہاں بیٹھی رہتی ہے۔ وہ ہر کام فرض کی تکمیل یا پیٹ کی آگ کو فرو کرنے کے لئے کرتی تھی۔ مگر اب کوئی اندرونی طاقت اسے منشی جی کی خدمت کرنے پر مجبور کرنے لگی۔

منشی جی بھی اس اچانک تبدیلی سے ناواقف نہ تھے۔ ان کی تیز نگاہ سے سادہ لوح سُکھیا اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ نہ رکھ سکی۔ وہ سمجھ گئے کہ ان کا داؤ چل گیا ہے۔ مچھلی نے گولی نگل لی ہے۔ لیکن ہوشیار شکاری کی مانند انہوں نے بے چینی سے کام نہ لیا۔ وہ اسے چاروں طرف سے اپنے دام میں پھنسانے کے لئے پوری پوری کوشش کرنے لگے۔

دوسرے دن سُکھیا حسبِ معمول دوپہر کے وقت منشی جی کے گھر اپنے

مقررہ کام پر گئی۔ تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہؤا کہ دروازہ کھلا رہنے پر بھی منشی جی کا کہیں پتہ نہیں۔ عموماً وہ ہمیشہ صحن میں بیٹھے نظر آتے تھے۔ اس نے دو ایک بار آواز بھی دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ وہ باہر جانے ہی والی تھی کہ پچھلے دالان سے کسی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ گھبرائی ہوئی دبے پاؤں کمرے سے ہوکر دوسری طرف گئی۔ دروازے کی آڑ سے اس نے دیکھا کہ منشی جی زمین پر بیٹھے ہوئے آنسو بہا رہے ہیں۔ متعجب ہوکر سوچنے لگی کہ بات کیا ہے؟ وہ اسی فکر میں تھی کہ منشی جی نے ایک ٹھنڈا سانس لیکر کہا۔ کہاں تک برداشت کروں آج رات کو زندگی سے ہاتھ دھونا ہی پڑیگا۔ ہائے سُکھیا! تیرے پیچھے مجھے خودکشی جیسے گناہ کبیر کا مرتکب ہونا ہی پڑیگا۔

سُکھیا کے پاؤں کانپ گئے۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ دل دھڑکنے لگا۔ کسی نے اس کے کان میں کہا۔ دیکھ تیرے ہی لئے منشی جی اپنی جان پر کھیل رہے ہیں۔ کیا اب بھی تجھے ان پر رحم نہیں آئیگا۔

سُکھیا سادہ لوح سُکھیا! اب اپنے آپ کو زیادہ دیر تک نہ سنبھال سکی وہ منشی جی کے جال کا مطلب نہ سمجھ سکی۔ اس نے ان کے مندرجہ بالا الفاظ میں مایوس محبت کی پوشیدہ خواہشات کی گرمی محسوس کی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ سادہ لوح ہرنی کو پھنسانے کے لئے ہوشیار شکاری کتنے مکروفریب کے جال پھیلاتے ہیں۔ وہ تو یہ سمجھتی تھی کہ تمام دنیا اس کی مانند سادہ لوح اور مکروفریب سے خالی ہے۔ وہ گھبرائی ہوئی منشی جی کے سامنے کھڑی ہوگئی اسے ایسا معلوم ہؤا جیسے منشی جی اسے دیکھ کر گھبرا گئے ہیں۔ انہوں نے

جلدی اپنا منہ کپڑے سے پونچھ ڈالا۔ اور اس کے بعد مجرم کی مانند اس کی طرف دیکھنے لگے۔

سکھیا نے کہا "یہ آج کیا ہو رہا ہے"

منشی جی نے مغموم لہجہ میں جواب دیا۔ "تمہیں مجھ سے کیا واسطہ؟ جو کچھ بھی ہو۔ جاؤ۔ گھر کا کام کرو"

بیچاری سکھیا رونے لگی۔ روتے روتے اس نے کہا۔ اب تو ایسا کہو گے ہی؟ تم سے واسطہ نہ ہوتا تو انہیں اتنے بخار میں چھوڑ کر یہاں آتی! اتنا کہہ کر اس نے اپنا منہ آنچل سے ڈھانپ لیا۔ منشی جی کے ہونٹوں پر لمحہ بھر کے لئے فتح کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ مگر جلدی ہی انہوں نے اسے سنجیدگی سے بدل ڈالا۔ اور بدستور پریشان نظر آنے لگے۔ انہوں نے پھر اسی آواز میں پوچھا "تو آج تم کیوں رو رہی ہو"

سکھیا نے روتے روتے جواب دیا "رلاتے جاؤ۔ اور پوچھتے جاؤ کیوں روتی ہو۔ ابھی ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

تو پھر کیا کروں؟ جب ضبط کی طاقت نے جواب دے دیا ہو تو پھر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟" منشی جی نے کہا۔

"کیا دوسرے کو تکلیف دیکر اپنے کو دکھ سے بچانا دھرم ہے"

"دنیا میں ایسا کون ہے۔ جس کو میرے مرنے کا دکھ ہوگا؟"

اتنا کہہ کر منشی جی نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

سکھیا بھی رونے لگی۔ روتے روتے اس نے کہا "جس کے لئے تم

جان دو گے کیا اس سے بھی پوچھا ہے؟"

منشی جی نے جواب دیا "اگر اس کو میری فکر ہوتی تو آج دنیا میرے لئے بہشت نہ ہوتی۔"

سُکھیا اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی بولی "فکر نہ ہوتی تو اپنے شوہر کو بخار میں بُھنتے چھوڑ کر تمہارے یہاں چلی آتی۔ مرد تو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی انجان ہی بنے رہتے ہیں۔"

منشی جی کی آنکھیں خوشی سے ناچنے لگیں۔ وہ اور چاہتے ہی کیا تھے؟۔ انہوں نے سُکھیا کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اسے آغوش میں لپٹا کر بولے سُکھیا! سُکھیا!! کیا تو سچ کہتی ہے؟۔

سُکھیا نے دھیمی آواز میں کہا "میں تم سے کب جھوٹ بولی۔"

اب کیا تھا؟ آج ان کی پرانی آرزو پوری ہو گئی۔

(۲۷)

سُکھیا کی اس اخلاقی پستی سے تیسرے دن اس کا جھلملاتا ہوا قسمت کا ستارہ ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔ وہ بیوہ ہو گئی۔ بدقسمت ہرکھو تین دن کے سخت بخار کے بعد بدقسمت سُکھیا کو چھوڑ کر چل بسا۔ آخری وقت اس نے منشی اشرفی لال سے کہا۔ منشی جی جیسے آپ نے میری پرورش کی ہے۔ اسی طرح سُکھیا کی بھی کیجئیگا۔ اسے میں صرف آپ کے سہارے چھوڑے جاتا ہوں۔

اسے کیا علم تھا کہ سُکھیا منشی جی کو کتنی پیاری ہو چکی ہے۔ منشی جی نے مصنوعی دکھ محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ہرکھو! سُکھیا کی طرف سے بے فکر

رہو - میرے جیتے جی اسے کھانے پینے کی کمی نہ ہوگی -
بیچارے ہرکھو کی آنکھوں میں احسان کے آنسو تھے - اور منشی جی کی آنکھیں حیوانی خوشی سے چمک رہی تھیں -
سکھیا رو رہی تھی - اور کئی دن تک روتی رہی - مگر اس کے دل میں آسمان تک پہنچنے والی دکھ کی لپٹیں اپنا قیامت خیز ناچ دکھا رہی تھیں - نہ رکنے والی آنسوؤں کی دھار سینہ پر مستقبل کی کشتی میں مختلف امیدوں کا تمغہ لئے رواں دواں تھی - اسکے دل کی گہرائیوں میں دل پذیر خواہشات کا مسکن تھا - اس کے بین و بکا میں مسرت بھیران کی شیریں راگنی لہرا رہی تھی -
ہرکھو کا کریا کرم ختم ہو گیا - اس کے چودھویں دن سکھیا منشی جی کے گھر آگئی منشی جی اسی کی انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے - اسے آتے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے - نہایت جوش سے ہم آغوش ہو کر بولے "سکھیا! یہ تیرہ دن بڑی مشکل سے گذرے -
سکھیا نے مسکرا کر اپنا سر ان کے سینہ پر رکھ دیا -
منشی جی نے کہا سکھیا اپنے راستہ کا کانٹا نکل گیا -
دم زدن بعد سکھیا نے جواب دیا "تم تو مجھے پوری طرح سے اپنا بنانا چاہتے تھے"
اب تمہارے سوا اس دنیا میں میرا کون ہے "
منشی جی "اب میری زندگی سکھ سے گذرے گی "
سکھیا "مگر مجھے کہیں منجدھار میں نہ چھوڑ دینا "

منشی جی "کیا تمہیں مجھ سے ایسی اُمید ہے؟"
سُکھیا "اُمید تو نہیں ہے مگر قسمت کے چکر کو کون روک سکتا ہے؟"
منشی جی۔ تمہارے بغیر زندگی محال ہے۔ تم اپنے دل میں ایسی بدگمانی کو کیوں جگہ دیتی ہو۔
کتنی ہی قسمیں کھا کر منشی جی نے اپنی کبھی نہ کم ہونے والی محبت کا ثبوت دیا۔ طویل گفتگو سے انہوں نے سُکھیا کو اس کے مستقبل کی خوشیوں اور فارغ البالی کا یقین دلایا۔ عہد و پیمان کا ایسا تار باندھا کہ بیچاری سُکھیا لاجواب ہو کر مستقبل کی خوبصورت امیدوں کے سراب میں گم ہو گئی۔ اور امیدوں کا ایک عظیم الشان محل تعمیر کرنے لگی۔

(۴)

سُکھیا اب مکمل طور پر منشی اشرفی لال کے زیر پناہ تھی۔ اس کو کھانے پینے کی تکلیف نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی مگر دنیا کے خوف کی وجہ سے صاف مگر موٹے کپڑے ہی پہنتی تھی۔ روپے پیسے کی بھی اسے کمی نہ تھی۔ کیونکہ منشی جی کی آمدنی اس کے ہاتھ آتی تھی۔ تاہم اس نے کبھی چھپا کر روپیہ جمع کرنے کی کوشش نہ کی۔ کیوں کرتی؟ اسے منشی جی کی طرف سے کسی قسم کا شک نہ تھا۔ ان کے عہد و پیمان پر پورا یقین تھا۔ وہ ابھی انسانی چالاکیوں سے ناواقف تھی۔ اور اپنے پیار کرنے والے کی محبت میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا تن من دھن اسی کے قدموں پر نثار کر دیا تھا۔ اپنا موجودہ اور مستقبل کا سُکھ۔ اپنا دھرم۔ اپنی عزت سب اس کے قدموں پہ نذرانہ کی صورت

میں چڑھا چکی تھی۔ اور اس زبردست ایثار کے پھل کی شکل میں اس نے پایا تھا۔ اپنے خیال کے بموجب محبت۔ سچی محبت۔ صاف اور کبھی نہ ٹوٹنے والی محبت مگر ابھی وہ امیدوں کی سرسبز وادی میں سیر کر رہی تھی۔ مایوسی اور عہد شکنی کی خوفناک شکل اس نے ابھی نہیں دیکھی تھی۔ آہستہ آہستہ گاؤں والوں میں منشی جی اور سکھیا کے متعلق کانا پھوسی ہونے لگی۔ گو کسی کے پاس کوئی خاص ثبوت تو نہیں تھا۔ تاہم سکھیا کے حسن میں روز افزوں اضافہ اور پہلے کی نسبت صاف شفاف لباس۔ اور اس کے خط و خال کی زیادہ دلکشی قیامت خیز تبسّم یہ تمام نشانات ایسے تھے جو کسی قسم کا شک پیدا کرنے کے لئے کم نہ تھے۔ وہ جوش شباب میں ایسی سرمست اور متوالی ہو رہی تھی کہ اسے دنیوی طعن و تشنیع کی قطعی فکر نہ تھی۔ اس کے سکھ کی انتہا نہ تھی۔!

اسی طرح کئی ماہ گذر گئے۔ یکایک وہ بات معلوم ہوئی۔ جس نے اس کے سکھ کا خاتمہ کر دیا۔ اطمینان بخش زندگی کی ندی بے اطمینانی کے سراب میں غائب ہو گئی۔ اور محبت کے عظیم الشان بلند و بالا مکان کی بنیاد ہل اٹھی۔ مرد ذات کے متعلق اس کا گہرا یقین پاش پاش ہو کر تمام دنیا کو تیرہ و تار بنانے لگا۔ کئی یوم سے سکھیا بیمار تھی۔ قریبی گاؤں کے ایک حکیم نے آکر اسے دیکھا۔ وہ دیکھتے ہی دنگ رہ گیا۔ بہت اصرار کرنے پر اس نے ایسی بات کہی۔ جس سے سکھیا اور منشی اشرفی لال دونوں کانپ اٹھے۔ کیونکہ اب ان کی ناجائز محبت کسی طرح چھپائے نہ چھپ سکتی تھی۔ سکھیا حاملہ تھی۔

تمام گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔ گھر گھر اس کا تذکرہ ہونے لگا بے کس

سکھیا کو ہر جگہ نفرت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ دنیا کا یہ عجیب اصول ہے۔ گناہ کوئی کرتا ہے اور سزا کوئی پاتا ہے۔ باپ کی ممنوع منہ زور خواہشات کے قصور پر بیٹے کو تمام زندگی ہدفِ ملامت بننا پڑتا ہے۔ انسان اپنی بُری خواہشات کے زیر اثر ستی سادھوی عورت کے آنسوؤں کو نظر انداز کر کے اس کی تباہی و بربادی کا موجب بنتا ہے۔ اور اس کی سزا کمزور و پریشان روح کو بھگتنی پڑتی ہے۔ طاقت ور کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ کمزور کی آواز کہاں سنی جاتی ہے۔

یہاں بھی جرم تھا کسی اور کا اور سزا ملی کسی اور کو۔ ظالم صاف بچ گیا سکھیا کی بیکس حالت۔ اس کے پیہم عرض و معروض۔ نہ رکنے والے آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے منشی جی نے کہا "سکھیا! مجھ سے یہ امید نہ رکھو کہ میں تمہیں کھلم کھلا اپنا بنا کر برادری سے خارج ہو جاؤں گا"

سکھیا نے عاجزانہ انداز سے کہا۔ کیا یہی تمہارا دھرم ہے؟ کیا تمہیں یاد نہیں ہے کہ تم نے کیسی کیسی قسمیں کھا کر مجھے اپنے بس میں کیا تھا؟

اشرفی لال نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ ان کی ہنسی میں سکھیا نے محبت کی بوسیدہ کشتی کو نفرت کی پرشور دھار میں غرق ہوتے دیکھا۔ اس نے زیادہ کہنا بے سود سمجھا۔ اسے منشی جی کی محبت کی اصلیت۔ حقارت اور خود غرضی کا پتہ لگ گیا۔ اس نے غرور سے تن کر کہا "منشی جی آپ نے مجھے تباہ و برباد تو کیا۔ اب ایشور سے پرارتھنا کرو کہ وہ تمہیں عقل سلیم عطا کرے۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں سخت تکلیف!

اسی دن پنچایت ہوئی۔ پنچوں نے پوچھا۔ کئی بار پوچھا۔ لیکن اس

نے صاف طور پر نہ بتلایا کہ حمل کس کا تھا۔ پنچوں نے کہا بتا دے جس میں تجھے اور تیرے بیٹے کو گذارہ دلا دیا جائے۔ لیکن سُکھیا نے زبان نہ کھولی۔ کچھ لوگوں نے منشی جی کا نام بھی لیا۔ لیکن اس نے کہا۔ نہیں۔ اس میں ان کا قطعی ہاتھ نہیں۔ وہ اتنے ذلیل اور کمینے نہیں۔

بالآخر پنچوں نے تنگ آ کر اسے ہی برادری سے نکال دیا۔ برادری میں شامل کر لینے کا صرف ایک ہی طریقہ بتایا گیا کہ وہ کسی اہل برادری سے شادی کرے۔ اور اس کے بعد دعوت کرے۔ ورنہ نہیں۔ لیکن سکھیا نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ برادری سے نکال دیئے جانے پر دو دن بعد سکھیا کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ گاؤں چھوڑ کر نہ معلوم کہاں چلی گئی۔

(۵)

منشی جی اب پانچ برس کے بعد دوسرے شہر میں چُنگی کے محرر تھے۔ ان کی دوسری شادی ہو چکی تھی۔ اور ان کے پہلے غیر معمولی یقین۔ دھوکا بازی اور حیوانیت کے انعام میں ایشور نے ایک اولاد بھی عطا کی تھی۔ اس قادر مطلق منصف کا کیسا انوکھا انصاف ہے۔

ان کے گھر کے قریب ہی ایک اناتھ بیوہ کی جھونپڑی تھی۔ اس کا چار سالہ لڑکا اکثر منشی جی کے لڑکے کے ساتھ بہت کھیلا کرتا تھا۔ اس کی دل کش شکل اور گھونگر والے بال دیکھ کر منشی جی خوش ہو جاتے تھے۔ ان کا دل اسے گود میں اٹھا لینے کو چاہتا تھا۔ لیکن ایک تو قوم کا خیال اور دوسرے مٹی سے لت پت کپڑوں کی وجہ سے وہ اپنی خواہش کو روک لیتے تھے۔

وہ اس بیکس کو ہر روز آتے جاتے دیکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے آج تک اس کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ ہاں ہاتھوں کی خوبصورتی۔ جسمانی تناسب سے اس کی شکل کے خیالی نظارے ان کے دل کو ضرور اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔ ان کا لڑکا تو اس کے ساتھ اتنا ہل جل گیا تھا کہ اسی کے ساتھ گھوما کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس کو اپنے بیٹے سے بڑھ کر پیار کیا کرتی تھی۔ ان کی بیوی بھی اس سے اتنی خوش تھی۔ کہ اس کے حسن و سلیقہ اور تحمل کی ہر لمحہ تعریف کیا کرتی تھی۔ لیکن اس میں ایک خصوصیت بھی تھی۔ اس میں اتنی خودداری تھی کہ خستہ حالی کے باوجود بھی اس نے کبھی بھول کر ایک پیسہ کی شے منشی جی کی بیوی سے نہ لی۔ انہوں نے ہر چند اصرار کیا۔ لیکن کسی طرح بھی اس کے مستحکم ارادے کو تبدیل نہ کر سکیں۔ تیوہار کے دن بھی اس نے ایک ٹکڑا پوری یا پکوان لینا قبول نہ کیا۔ کبھی کبھی منشی جی کی بیوی اس کے اس برتاؤ سے ناراض ہو جاتی تھی۔ لیکن کیا کر سکتی تھی۔ سخت محنت و مشقت کے بعد دو چار پیسے جو ملتے وہ اس سے اپنا اور اپنے بیٹے کا گذارہ کر لیتی تھی۔ خود بھوکی رہتی اور جب کبھی اس کا ننھا بچہ بھوک کی تکلیف سے بے چین ہو جاتا تو بھی وہ اپنا ضبط و امن نہ چھوڑتی۔ وہ غریب تھی تو کیا۔ مگر اس نے بھول کر بھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ ہاں مزدوری کے طور پر اگر کسی نے کچھ دے دیا تو وہ اسے بخوشی قبول کر لیتی تھی۔ لیکن اس حالت میں بھی اس نے منشی جی کے یہاں سے ایک کوڑی نہ لی۔ مدد کے طور پر منشی جی ہر چند اس کو بہت کچھ دینا چاہتے تھے۔ لیکن وہاں کون لیتا تھا۔ عجیب خود ضبطی اور بے پروائی تھی۔ قدرتی بھروسہ تھا اور عجیب و غریب قناعت

تھی۔

اسی طرح کئی مہینے گذر گئے۔ بیکس بیوہ کا دل منشی جی کے بیٹے کی محبت سے متاثر ہونے لگا۔ وقت پاتے ہی وہ اسے کھلانے چل پڑتی۔ اس کو خوش کرنا ہی اس کا واحد مقصد معلوم ہوتا تھا۔ اس کی انگلی دکھتے ہی وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ دن رات بیٹھ کر اس کی خدمت و تیمارداری کرتی۔ اس کی اسس گہری محبت کو دیکھ کر بہت لوگ اسے لڑکے کی پہلے جنم کی ماں کہتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ نہایت خاموش اور تاریک شب کو منشی جی کے چوپال میں آگ لگ گئی۔ ہوا کی تیزی سے آگ غیر معمولی تیزی سے پھیلنے لگی۔ ہر چند کوشش کی گئی۔ لیکن آگ کے خوفناک حملے میں کوئی کمی رونما نہ ہوئی۔ منشی جی اور ان کی بیوی دونوں کسی طرح باہر نکل آئے تھے۔ لیکن ان کا لڑکا اندر ہی رہ گیا تھا۔ آگ نے خوفناک شکل اختیار کر لی تھی۔

ماں کی دلدوز اور جگر خراش چیخ اور پکار۔ اور اس کی دیوانہ وار بین و بکا سے بھی مجمع کا کوئی شخص میدان میں نہ آ سکا۔ جب اس کا ٹیناتت کے ہمیشہ گھومتے ہوئے کال چکر کی ہیبت ناک دُھن میں بے کس اور پاکیزہ ہستیوں کی پکار۔ خلائقِ عالم کے بہرے کانوں میں نہیں پہنچتی۔ تو پھر دنیا میں کون کس کی سنیگا۔ ہر شخص کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔

منشی جی کی پڑوسن نے یہ خبر سنتے ہی ابلا ہوتے ہوئے بھی وہ کام کر دکھایا جو بڑے بڑے بہادر اشخاص بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ جھپٹ کر اس جلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئی۔ اہلِ مجمع مسحور اشخاص کی مانند اس

کے عدیم المثل ہمت وحوصلہ کو دیکھتے رہ گئے۔ چند لمحہ بعد وہ اس بچے کو اپنی گود میں چھپائے باہر آئی۔ مگر اس وقت عجیب وغریب انقلاب تھا۔ اس کے کپڑے جل رہے تھے۔ اور بال قطعی طور پر صاف ہو چکے تھے۔ تمام جسم پر بڑے بڑے چھالے دکھائی دینے لگے تھے۔ لوگوں نے لپک کر اس کے کپڑوں کی آگ بجھا دی۔

منشی جی کی بیوی نے دوڑ کر اپنے لخت جگر کو کلیجہ سے لگا لیا۔ اور اس کے بعد اس کی طرف لپکی جو اپنی جان پر کھیل کر اس کے لخت جگر کو جلتی ہوئی آگ سے نکال کر باہر لائی تھی۔ اور جو اب اپنی زندگی کے آخری لمحہ گن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ منشی جی بھی اس کے نزدیک آکر کھڑے ہو گئے۔ لیکن اس کو دیکھتے ہی وہ ایک خوفناک چیخ مار کر اس کے قریب بیٹھ گئے۔ انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا "سکھیا! سکھیا!! تو دیوی ہے۔ اور میں ایک حقیر ناچیز انسان نما حیوان!" سکھیا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو گوہر شاہوار نکل کر اس کے رخسار پر آ گئے۔ اس نے اپنے لڑکے کی طرف بغور دیکھا۔ اور پھر آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ منشی جی سمجھ گئے کہ اسے اپنے لڑکے کی فکر ہے۔

انہوں نے اس معصوم بچے کو اپنی گود میں کھینچ کر کہا "سکھیا! اس لڑکے کی فکر نہ کر۔ میں ایشور کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اسے اپنے لڑکے سے بھی بہت زیادہ خوش رکھوں گا۔"

سکھیا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اور وہ موت کی گود میں ہمیشہ کے لئے محو خواب ہو گئی۔

گاؤں کے مغرب میں

In the west of the village

(کناڑی زبان سے ترجمہ)

——— "لنگا ؟"

——— "حضور!"

——— "گاؤں کے پاس آکر بھی راستہ بھول گئے نہ ؟"

——— ہاں حضور! یہاں کوئی سفید سی چیز دکھائی دیتی ہے

شاید یہی راستہ ہو ——— نہیں! نہیں!! وہاں پانی بہہ رہا ہے۔ یہ ایک تالاب ہے۔ دیکھئے نہ۔ وہیں سے پانی بہنے کی آواز سنائی دے رہی ہے!"

شاید اسی گھاٹی پر چڑھنے سے راستہ معلوم ہو جائے ——— آؤ اس طرف چلیں۔

ہم دونوں گھاٹی پر چڑھنے لگے۔شام ہو چکی تھی۔ لِنگا بڑی مشکل سے آگے دلدل میں چل رہا تھا۔اس کے پیچھے میں گھوڑے پر سوار تھا۔ اوپر سے پانی برس رہا تھا۔

چھٹی ہونے کے باعث میں اس روز علی الصبح ہی بنگلور سے اپنے گاؤں کے لئے چل پڑا۔

قصبے میں موٹر بس سے اتر کر وہاں کے ایک سرکاری افسر سے جو میرے واقفوں میں سے ایک تھے۔سواری کے لئے گھوڑا مانگا اور نوکر لِنگا کو ساتھ لئے اپنے گاؤں کی جانب روانہ ہوا۔ لِنگا راستے سے واقف نہیں تھا۔ اس جنگلی راستے پر اگرچہ میں دس بیس مرتبہ گھوم پھر چکا تھا۔ پھر بھی راستہ بھول گیا۔

"لِنگا!"

"جی حضور!"

"پیٹی بہت بھاری تو نہیں"

نہیں حضور! دیکھنے میں تو بڑی بھاری بھر کم ہے۔ لیکن وزن کچھ بھی نہیں۔ اس میں کیا ہے صاحب!"

"چار کتابیں۔ دو کپڑے۔ میرے چھوٹے بھائی کے لئے ایک چمکی کی ٹوپی۔ ایک جوڑہ بوٹ۔ میری بہن کے لئے کچھ کھلونے۔ بس اتنی ہی تو چیزیں ہیں"

"آپ کو بنگلور گئے کتنے دن ہوئے ہونگے مالک!"

گذشتہ سال گرمی کی چھٹیوں میں گیا تھا۔ اب گاؤں کو واپس جا رہا ہوں اس کے بعد سال بھر میں راستہ کتنا بدل گیا۔ اسی لئے تو مجھے اب معلوم ہی نہیں کہ ہم کہاں اور کدھر جا رہے ہیں۔

ہم تینوں یعنی میں۔ لنگا اور گھوڑا بہت پریشان تھے۔ کچھ دیر تک ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ مجھے تو جلدی گھر پہنچ کر تمام لوگوں سے ملنے کی ازحد خواہش تھی۔ میرا بھائی ٹوپی اور بوٹ کی راہ دیکھ رہا ہوگا۔ اس کے سوا بہن کے لئے کچھ کھلونے بھی میں نے لئے تھے۔ والد صاحب سے یہ بات گوش گذار کرنی تھی کہ میں نے امتحان میں پرچے خوب اچھے کئے ہیں۔ اور ماں سے تو بہت سی باتیں کہنی تھیں۔ ہم نے گھاٹی پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھا۔ گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے میں نے سیگرٹ جلانے کی کوشش کی۔ بہت کچھ کوشش کرنے پر بھی دیا سلائی میں آگ نہ لگی۔ ایک تو پانی برس رہا تھا۔ اور دوسرے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے سیگرٹ جلائی۔ گھوڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

"لنگا!"

"جی حضور!"

صبح ہونے تک یہیں بیٹھ رہنا ہوگا۔

اس وقت گھوڑے نے کان کھڑے کئے۔

"صاحب ذرا سنیئے گا!"

میں نے توجہ سے سنا تو دائیں جانب سے کُتے کے بھونکنے کی آواز

آرہی تھی۔

جدھر سے کتے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اسی طرف چلیں تو شائد کوئی گاؤں مل جائے۔ آپ آس پاس کے درخت پودے دیکھتے رہیگا۔ تاکہ اصلی۔ راستہ معلوم ہو جائے۔

تھوڑا دائیں جانب گھوم کر ہم نے گھاٹی سے اترنا شروع کیا۔ پھر کتے کا بھونکنا سنائی نہ دیا۔ تھوڑی دور چل کر لنگا نے پوچھا —— وہ جو وہاں دکھائی دیتا ہے۔ کیا ہے صاحب!"

میں نے اس طرف دیکھا جہاں لنگا اشارہ کر رہا تھا۔

ارے وہ تو ایک درخت ہے۔ واہ رے پاگل! میرے نزدیک گھوڑے کی بغل میں آجاؤ۔ ڈر دست! تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ تم پڑھنا لکھنا جانتے ہو۔

ہاں حضور۔ جانتا ہوں۔ کہانی سنائیے۔

ہم ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ میں لنگا کو کہانی سنانے لگا۔

انگریزی فوج کا کاویری عبور کر کے آنا۔ سلطان کا قلعہ کا دروازہ بند کر دینا۔ لڑائی۔ دوپہر کو انگریزوں کا قلعہ پر چڑھائی۔ اور نشانہ لگانا۔ اس وقت ٹیپو سلطان کا کھانا تناول فرمانا۔ یہ خبر سنتے ہی کھانا چھوڑ۔ گھوڑے پہ بیٹھ کر قلعہ میں آنا۔ شام تک لڑائی کرنے کے باعث گر پڑنا۔ اور اس خیال سے یا مقصد سے کہ کسی کو معلوم نہ ہو لاشوں کے درمیان اس کا چھپ جانا۔ ان کے سونے کے کمربند پہ کسی کا ہاتھ ڈالنا۔ ٹیپو کا تلوار چلانا۔

انگریزوں کا ٹیپو کے بچوں کو قید کر لینا۔ ٹیپو کی لاش کو لالٹین کی روشنی میں تلاش کرنا۔ رات بھر سپاہیوں کا سری رنگ پٹن کو لوٹنا۔ ان کی اس لوٹ مار کو سہہ نہ سکنے کے باعث۔ عورتوں اور بچوں کا صبح تک راستے میں کھڑے رہنا۔ دوسرے دن صبح ٹیپو کی لاش کا دفنایا جانا۔ وغیرہ میں اسے سنانے لگا۔

کہانی تو بہت اچھی ہے صاحب!

اب اُٹھیں آگے چلیں۔

ہم چل پڑے۔ لنگا نے پھر درخت کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا کہیں درخت بھی اس طرح کا ہوتا ہے۔

لنگا میرے پاس ہی گھوڑے کی بغل میں چل رہا تھا۔ اندھیری رات میں وہ درخت بڑا خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔ میں یہ سوچ کر گھوڑے پر سے نیچے اُتر پڑا کہ کہیں لڑکا ڈر نہ جائے۔

اس درخت کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ لنگا! یہاں سے ہمارا گاؤں بہت ہی نزدیک ہے۔ اسی درخت کو دیکھ گذشتہ سال ہمارا شیام ڈر گیا تھا۔

"وہ یہاں کیوں آئے تھے۔ راستہ بھول گئے تھے کیا؟"

گذشتہ گرمیوں میں میں اپنے گاؤں گیا تھا۔ تو ایک روز شام کو میں اور میرا چھوٹا بھائی سیر کو نکلے۔ اس وقت شیام کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ تاریخ میں جو جو کہانیاں اس نے پڑھی تھیں۔ وہی جو میں نے ابھی تمہیں سنائی ہیں۔ سب مجھے سنانے لگا۔ شیام بڑا عقل مند لڑکا ہے۔ بہت ہی اچھی کہانیاں

سناتا ہے۔ مگر شری رنگ ٹپن کی کہانی سناتے وقت وہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ اسے وہ کہانی بڑی پیاری لگتی ہے۔ اس سے اس کو اس قدر محبت اور اُنس ہے کہ کیا کہوں ؟ مجھے اکثر تنگ کرتا رہتا ہے۔ اور کہا کرتا ہے کہ مجھے شری رنگ ٹپن کب دکھلاؤ گے۔ وہی کہانی سناتے سناتے اس روز رات ہوگئی۔ ہم لوگ راستہ بھول گئے۔ اور اس درخت کے پاس آگئے۔ اس درخت کو دیکھ شیام ڈر گیا۔ گھر جاتے ہی اسے بخار چڑھ آیا۔ اور دو تین دن تک بخار کم نہ ہوا۔

اب تو آپ یہاں سے راستہ اچھی طرح جانتے ہونگے۔ یہاں سے آپ کا گاؤں کتنی دور ہے۔

یہاں سے ہمارے گاؤں جانے کا کوئی درست راستہ تو نہیں ہے۔ بڑی ہوشیاری سے جانا ہوگا۔ یہ ہمارے گاؤں کا قبرستان ہے۔ یہاں سے ہمارا گاؤں تقریباً آدھ میل کے فاصلہ پہ ہے۔

وہ چونک کر بولا۔ ہیں یہ کیا ہے ؟"

میں نے غلطی کی جو اس سے کہہ دیا کہ یہ قبرستان ہے۔ وہ ابھی چھ دہ برس کا ہی تھا۔ اگر ڈر جائے تو ؟

یہاں سے کچھ دور دائیں جانب چلنا پڑیگا۔ یہ درخت ہمارے گاؤں کی مغربی سمت میں ہے۔

پانی کا برسنا بند ہوگیا تھا۔ تاریکی چاروں طرف چھائی ہوئی تھی چاروں طرف مینڈک ٹر۔ ٹر کر رہے تھے۔ بنگا پیچھے پیچھے دیکھتا ہوا آ رہا تھا

اُس کے دل کا خوف میں پہچان گیا۔ میں نے سوچا کہ اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ بولتے ہی رہنا چاہیئے۔

"لنگا!"

وہاں دیکھیئے صاحب! ـــــــ اور اُس نے پیچھے کی جانب اشارہ کیا

واہ رے ڈرپوک! تمہیں بھوتوں سے ڈر لگتا ہے؟"

اس نے دوبارہ کہا۔ وہاں دیکھیئے تو سہی۔

میں نے پیچھے کی جانب مڑکر دیکھا۔ ہم جس پتھر پر بیٹھے کہانی سن اور سنا رہے تھے وہیں پر ایک چراغ جل رہا تھا۔ اور دو شخص چراغ کی دائیں جانب آمنے سامنے بیٹھے زمین کی ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری سانس زور سے چلنے لگی۔ اور میں خوف کھانے لگا۔

"لنگا! تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟"

حضور دیکھیئے نہ۔ چراغ۔ اس طرف۔ اس طرف ڈرو مت۔ نزدیک چل کر دیکھ آئیں۔

"صاحب! اس طرف دیکھیئے ـــــــ"

وہاں ایک چراغ جل رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں لنگا اور دوسرے ہاتھ میں گھوڑے کی لگام پکڑ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہیں اس طرف چل پڑا۔ نزدیک آتے ہی معلوم ہوا کہ ہم نے جو کچھ بھی وہاں سے دیکھا تھا۔ بالکل درست تھا۔ آدمیوں کے بولنے کی بھی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ہمیں ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ہم دونوں ان کی باتیں سننے لگے۔

ہائے! میرے پیارے لال! تم نے دودھ مانگا تھا نہ۔ پیٹو میرے بچے!
میں دودھ لائی ہوں۔ پیٹو میرے لال! تم تو دن بدن کمزور ہوتے گئے اور آخر
چلے ہی گئے۔ آخری دن تم نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔ مگر تمہارے منہ
سے بات تک بھی نہ نکل سکی۔ اور تم میری ہی طرف دیکھتے رہ گئے۔ بیٹا! تم
نے کیا کہنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت تمہاری آنکھوں سے ایسا ظاہر ہو
رہا تھا کہ تم ہمیں چھوڑ کر کسی اور جگہ جانا نہیں چاہتے۔ لال! میرے پیارے
لال!! اور اب اس جنگل میں اکیلے ہی سو گئے ہو"
یوں کہہ کر وہ عورت وہاں گلاس میں دودھ ڈال کر سسک سسک کر رونے
لگی۔ ہمیں اس چراغ کی روشنی میں معلوم ہوا کہ وہ دو نو عورتیں تھیں۔ میں نے لنگا
کے کان میں آہستگی سے کہا۔ کوئی رو رہا ہے۔ ڈرو مت۔
دوسری ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ روتے ہوئے اس نے کہا۔ بھیا کو خط تک
بھی نہ لکھ سکے۔ دو ہی دنوں میں ایسا ہو گیا۔ ہائے ——
میں نے دو قدم آگے بڑھائے۔ اسی وقت ہماری بائیں جانب کا چراغ
بھی وہاں آپہنچا۔
یہ کیسا پاگل پن ہے۔ تاریک شب میں اس طرح وہاں آنا کیا ٹھیک ہے
جو ہو گیا وہ واپس تو نہیں لوٹیگا۔ گھر چلو!"
میں نے آواز پہچان لی۔ وہ میرے والد صاحب تھے۔
لال! تم تو اندھیرے سے اتنا ڈرتے تھے مگر آج یہاں اکیلے سو گئے
ہو۔ ایک مرتبہ تم اسی جگہ ڈر گئے تھے۔ اور تمہیں اس وقت بخار ہو گیا تھا۔

اب یہاں اکیلے سونے میں تمہیں ڈر نہیں لگتا کیا؟ تمہیں یہاں تنہا چھوڑ میں کیسے گھر جاؤں میرے لال!

یہ میری ماں کی آواز تھی۔

بھیا بوٹ اور ٹوپی لائیگا۔ سُنہری رنگ پٹن کی کہانی اسے اب کون سنائیگا بھیا اب کیسے سُنہری رنگ پٹن دکھائیگا۔ وہ کتنا روئے گا او شیام ——

یہ میری بہن کا ورلاپ تھا۔

اس وقت میری جو حالت تھی۔اس کا بیان کرنا ناممکن ہے۔مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔کہ اس لامحدود دنیا میں میں اکیلا ہوں۔ننگا نے مجھے زور سے پکڑ لیا تھا تاکہ میں آگے نہ جا سکوں۔مگر میں نے اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔اور اس جگہ پہنچ گیا۔میرے والد صاحب نے پوچھا "کون ہے؟" اور انہوں نے لالٹین اوپر اٹھائی۔

میں نے پوچھا "کیا ہے والد صاحب؟"

مجھے دیکھ کر سب آنسو بہانے لگے۔میں نے بہت دیر تک شیام کی قبر پر آنسو بہائے۔ایک نہ ایک جگہ سب آنسو بہا رہے تھے۔ننگا بھی رو رہا تھا غم کا جوش جب قدرے کم ہوا۔تو میں نے اپنی پیٹی میں سے ٹوپی نکال کر شیام کی قبر پر رکھ دی۔اور بوٹ کو بھی اس کے نزدیک ہی رکھ دیا۔شیام نے مجھ سے ایک مرتبہ پوچھا تھا" بھیا! یہ درخت اور پودے رات کے وقت اس جنگل میں اکیلے کیسے رہتے ہیں؟ یہ بات مجھے یاد آگئی۔اس روز میں نے رات کو وہیں رہنے کا ارادہ کیا۔اور گھر نہیں گیا۔رات

پھر ہم سب وہیں رہے۔ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شیام کی بیماری گھر میں وہ سب کو کتنا پیارا لگتا تھا۔ کتنا خوبصورت تھا۔ کیسا ذہین۔ اور تیز فہم تھا۔ گاؤں بھر میں وہ سب کو کتنا پیارا لگتا تھا۔ اسے جو کوئی بھی دیکھتا۔ خوش ہو جاتا وہ کتنا ہوشیار تھا۔ یہ ہی سب باتیں کر رہے تھے۔

آخر والد صاحب نے کہا۔" ہم سب کو ایک نہ ایک دن یہاں آنا ہی ہوگا"
ٹھنڈی ہوا چلنے لگ گئی تھی۔ میں نے کہا۔" ہاں!"

وہ انجان پیارا بچہ! جہاں ایک مرتبہ ڈر گیا تھا۔ وہیں اس نے مستقل طور پر اپنا ڈیرہ جما لیا۔ اور ہم گھر گئے ——— گھر

انصاف

(مرہٹی زبان سے ترجمہ)

وہ گاؤں شکاریوں کی ایک ایسی آماجگاہ بن گیا تھا کہ لوگ اس کا اصلی نام ہی بھول گئے تھے۔ اور ریلوے ٹائم ٹیبل میں وہ شکار روڈ کے نام سے لکھا جانے لگا۔

طویل رخصتوں کے دنوں میں شکاریوں کے گروہ کے گروہ بمبئی سے آنے والی ہر ایک گاڑی سے اس سٹیشن پہ اترتے تھے۔ سٹیشن کا چھوٹا سا پلیٹ فارم شکاریوں کی بندوقوں۔ ان کے بستروں اور ٹوپوں سے بھر جاتا تھا۔ اور جب وہ اپنے بوٹوں کو چرچراتے ہوئے شاہی ڈھنگ سے چلتے تو ان کا تماشہ دیکھنے کے لئے گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے کچھ فاصلہ پر جمع ہو جاتے تھے۔ وہ تو رہی چھٹیوں کی بات! لیکن ویسے بھی ہر آخری

ہفتہ کو اکثر شکاری آتے ہی رہتے تھے۔ جن امیروں کے پاس کرنے کو اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ جب ان کی مرضی ہوتی وہاں آجاتے۔ وہ کسی بھی دن کسی گاڑی سے وہاں شور مچاتے ہوئے اترتے سیگرٹ کا دُھواں اُڑاتے ہوئے چلتے۔ اور گاؤں کے قلیوں کے سروں پر اپنا بھاری اسباب لادکر ڈاک بنگلہ کی راہ لیتے۔

گاؤں کے چھوٹے بچے ان شکاریوں کے لمبے بوٹوں اور ٹیڑھے ٹوپوں کو بڑے اشتیاق سے دیکھتے۔ انہیں وہ قابل تعظیم دیوتا کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ وہ مل کر شکار کا کھیل کھیلتے۔ اپنی چھٹی ٹوپیوں پر کاغذ کا ٹکڑا رکھ کر ٹوپ بنا لیتے۔ شکاریوں کی طرح بے مطلب بڑی بڑی باتیں بناتے۔ اور ان ہی کی طرح لکڑی کو ہلاتے ہوئے چلتے۔ کبھی کبھی بڑے آدمی بھی شکاریوں کی آمد سے خوشی محسوس کرتے۔ کیونکہ وہ قلیوں اور مددگاروں کو اچھا انعام دے جاتے تھے۔ لیکن گاؤں کے زیادہ تر باشندے شکاریوں کی آمد سے خوش نہ تھے۔ کچھ شکاری رحم دل ہوتے تھے۔ لیکن زیادہ تر ظالم اور جفا کار ہی ہوتے تھے۔ وہ کسی بھی گاؤں کے باشندے کو برا بھلا کہہ بیٹھتے تھے۔ ان سے بُرے سے بُرا کام لیتے۔ اور دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد اجرت دیئے بغیر لاتیں مار مار کر انہیں بھگا دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کئی شکاری ان کی فصل کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے جب ایک شکاری کو شکار نظر آتا ہے تو وہ پاگل کی طرح اس کا تعاقب کرتا ہے وہ نہ تو ہری بھری کھیتی کی پرواہ کرتا ہے۔ اور نہ کسی اور چیز کی ان ظالموں کے خلاف اہل گاؤں آواز تک نہ اٹھاتے تھے۔ وہ لہو کے

گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔ انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ انصاف کسے کہتے ہیں اور وہ کیسے مل سکتا ہے۔ اور ان میں سے چند ایک تو اور کچھ نہیں یہ کل یُگ ہے اتنا کہہ کر دل کو تسلی دے لیا کرتے تھے۔

اس لئے جب کسان شکاریوں کی آمد کی بات سنتے تو انہیں جی بھر کر کوستے۔ ان کی عورتیں چلا چلا کر ان ٹوپی والوں کو گالیاں دیا کرتیں۔ تاکہ وہ ان کے کانوں تک پہنچ جائیں۔

بچے اپنے بزرگوں کی اس نفرت کا باعث نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ بڑے ہوتے تو شکاریوں کا دل کھول کر خیر مقدم کرتے —— شکاری جن کے پاس چمکتے ہوئے فولاد کی بندوقیں۔ چمڑے کی پیٹی میں لٹکتی ہوئی سیٹی اور چاقو تھے۔ اور جو بلند آواز میں بڑی بڑی باتیں کرتے تھے۔ اس لئے جہاں بڑے بڑے شکاریوں کو گالیاں دیتے تھے وہاں چھوٹے بچے خوش ہو کر انہیں "صاحب"! "صاحب"!! کہہ کر پکارتے تھے۔ اور اپنے ماں۔ باپ کو دھوکا دیکر ان کے پیچھے پیچھے چلے جاتے تھے۔

یہ کہانی جس زمانے سے تعلق رکھتی ہے اس زمانے میں شکاری اس گاؤں میں آئے تھے۔ اور شری پتی آنکھ بچا کر ان کے پیچھے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں جو نزدیک ہی گھاس کاٹ رہی تھی۔ اس کا مطلب سمجھ گئی ہے تو اس نے بھاگنے کا ارادہ بدل لیا۔ اپنے ساتھیوں کو جو فاصلہ پر کھڑے اس کی انتظار کر رہے تھے۔ اس نے اشارے سے تمام باتیں سمجھا دیں۔ اور کہہ دیا کہ موقع پاتے

ہی وہ ان کے پاس پہنچ جائیگا۔

اس کے ہمراہی چلے گئے۔ اس نظارہ کو دیکھ کر شری پتی کی دل میں اس قدر جوش پیدا ہوا کہ اس نے منہ میں انگلیاں ڈال کر سیٹی بنائی اور پھر اپنی ماں کے ہاتھوں سے کاٹی ہوئی گھاس کی گھٹری باندھ کر اٹھانے میں لگ گیا۔ اس کی ماں مکتا نے یہ سب کچھ دیکھا اور کہا " یہ کیا تماشہ ہے؟ کیا دوسرے الوؤں کی طرح تو بھی شکاریوں کے پیچھے پاگل ہو گیا ہے۔ ان شکاری بندروں کو دیکھ کر ہی تو سیٹی بجا رہا تھا۔ یہی نہ؟"

—— " نہیں! ماں میں نے سیٹی اس لئے نہیں بجائی تھی کچھ چڑیاں سامنے کے پودے سے اناج کھا رہی تھیں۔ اس لئے میں نے اُدہر پتھر پھینکا اور سیٹی بجادی۔ شری پتی نے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے کہا۔

سیٹی سے پہلے پتھر پھینکنے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ مکتا جانتی تھی کہ شری پتی جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن وہ خاموش رہ گئی۔ شری پتی اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اور برسوں کی دعاؤں اور دیوی دیوتاؤں کی منتیں مانگنے کے بعد پیدا ہوا تھا۔ وہ اسے اتنا پیار کرتی تھی۔ کہ اس کو اس جھوٹ کے لئے سزا نہ دے سکی۔ وہ کوئی راگ گنگناتی ہوئی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اپنی ماں کو کام میں مصروف دیکھ کر شری پتی نے شکاریوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ وہ بہت دور نکل چکے تھے۔ اس نے ایک آہ بھری۔ شکاریوں کے پیچھے بھاگنے کا لطف جاتا رہا۔ اس سوچ میں وہ بھول گیا کہ اس نے اپنی ماں سے ابھی ابھی جھوٹ بولا تھا۔ اسے تو یہ تماشہ نہ دیکھ سکنے کا رنج تھا۔

اس نے آفتاب کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ لیکن اس کے غروب ہونے میں ابھی نصف گھنٹہ کی دیر تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید شکاری دوڑتے ہوئے ایک بار پھر اُدھر نکل جائیں۔

اس خیال سے اسے کچھ تسکین ہوئی۔ دل ہی دل میں مسکرایا۔ اپنی دھوتی اونچی کی۔ اور خوش ہو کر گھاس کے مٹھے کو باندھنے لگا۔

نصف گھنٹہ گذر گیا۔ تکا گھاس کاٹتی ہوئی کھیت کے دوسرے سرے کی جانب دور نکل گئی تھی۔ آفتاب آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ گنّے کے پودوں کا سایہ شری پتی کے اوپر پڑ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ گھاس کی کچھ اور گٹھڑیاں باندھ کر وہ اپنی ماں کو گھر چلنے کے لئے کہیگا۔

اسی وقت کوئی چیز تیر کی طرح اس کے پاس سے ہو کر نکل گئی۔ اس نے دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ کیا تھا۔ دو ہرن نہ جانے کدھر سے تیر کی مانند بھاگ آئے تھے۔ اور دو گیندوں کی طرح بھاگ کر چلے گئے۔ شری پتی خوشی سے چلایا۔ گھاس میں لات ماری اور پاگل کی طرح ہرن کے پیچھے بھاگا۔ وہ ہرنوں کو گنّے کے کھیت میں چھپ کر صاحب کے شکار کا مزا کرکرا کرنے سے روکیگا ایسا کرنے کا اس نے ارادہ کر لیا۔ لیکن کیا سات برس کا بچہ ہرنوں تک پہنچ سکتا تھا۔ وہ بجلی کی طرح کھیت میں داخل ہوئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد صرف پودوں کے کھڑکھڑانے کی آواز سنائی دی۔

شری پتی کا بھاگنا کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوا۔ وہ مایوس ہو کر ہانپتا ہوا کھیت کی منڈیر پر کھڑا ہو گیا۔

اُسی وقت دو بندوقیں ہوا میں چلیں۔ ایک گولی شری پتی کے پاس سے ہو کر نکل گئی۔ اور اس سے پیشتر کہ وہ سنبھلے۔ دوسری گولی آئی اور شری پتی کے دل پر لگی۔ گویا وہ اسی کے لئے چھوڑی گئی تھی۔

اس کی چیخ نکل گئی۔ اور بعد ازاں زمین پر گر پڑا۔ اس کی چیخ سے اپنے اپنے گھونسلوں میں جاتی ہوئی چڑیاں بھی کانپ اٹھیں۔

(۲)

جن شکاریوں نے گولی چلائی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے۔ اور ہرن کی بجائے ایک چھوٹے لڑکے کو موت کے منہ میں لیٹے ہوئے دیکھ کر سہم گئے۔ ادھر ادھر سے کچھ گاؤں کے باشندے وہاں جمع ہو گئے۔ کسی نے مکتا کو بھی اس امر کی اطلاع دی۔ اور وہ چھاتی پیٹتی اور سر کے بال نوچتی ہوئی آئی وہ اپنے مرتے ہوئے بچے کے پاس خاک میں لیٹ گئی۔ اور پاگل کی طرح اس کی خون آلودہ چھاتی کو چومنے لگی۔

شکاریوں میں سے ایک ڈاکٹر تھا۔ اس نے شری پتی کی مرہم پٹی کی۔ اور اسے اٹھا کر ڈاک بنگلہ پر لے گیا۔ لیکن افسوس وہ بدقسمت لڑکا جانبر نہ ہو سکا۔ اس دنیائے فانی سے راہی ملک عدم ہوا۔

شری پتی کا باپ ابا اور ماموں ہیوتی کسی کام سے پونہ گئے ہوئے تھے۔ وہ دوسرے دن لوٹ آئے۔ آبا پونہ سے اپنے بچے کے لئے ایک نئی دھوتی۔ ایک گیند اور سلیٹ اور ماموں اپنے بھانجے کے لئے رنگین شیشے کا چشمہ لایا تھا۔ شری پتی کی موت کی خبر سن کر دونوں کے

پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ملنا غمگین صورت بنائے غم سے نڈھال باورچی خانہ میں کھانا بنا رہی تھی۔ کیا یہ دونوں اسے تسلّی دے سکتے تھے۔

شکاریوں کے پاس دل نہیں ہوتا۔ لیکن اس دردانگیز سانحہ نے انہیں بھی چوٹ پہنچائی۔ وہ آبا کے پاس پہنچے اور اس کو اس کے عوض روپیہ دینے لگے۔ مگر اس نے جواب میں کہا۔ ـــــ "میں عدالت میں جا کر تمہیں سزا دلواؤں گا۔"

شکاری کیا کر سکتے تھے۔ وہ ڈاک بنگلہ کو لوٹ آئے۔ اسی رات کو آبا نے پونہ جا کر ایک وکیل کیا اور عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔

(۲۳)

دوسرے دن ہیوتی ڈاک بنگلہ کے اردگرد چکّر لگا رہا تھا۔ اس نے شکاریوں کو برآمدے میں گپیں ہانکتے دیکھا اور لوٹ آیا۔ آبا رات کو پونا سے واپس آ کر کہنے لگا۔ مقدمہ دائر ہو گیا ہے۔ میں نے سب سے اچھا وکیل کیا ہے۔ اور ہمیں اس مقدمہ میں فتح ضرور حاصل ہوگی۔

مُلنا نے اس کی باتوں کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی۔ اسے اس وقت رنج و غم کے سوا اور کچھ بھی نہیں سوجھتا تھا۔ ہیوتی نے اپنی بھویں چڑھائیں اور زبان سے ایک نقطہ بھی نہ نکالا۔ آدھی رات کو آبا باہر آیا۔ اس نے ہیوتی کو باہر جاتے دیکھا۔

ـــــ "کون ہیوتی!"

ـــــ "ہاں!"

——— "اس وقت کہاں جا رہے ہو؟"

——— "کہیں نہیں۔ یوں ہی ذرا!"

اتنے میں آبا کی نظر ہیوتی کی کلہاڑی پر جا پڑی "یہ کلہاڑی کس لئے؟ اس سے رات کو تم کیا کرو گے؟"

"مجھے عدالت سے انصاف کی ذرا بھی امید نہیں۔ خون کا بدلہ خون" میری نظروں میں تو انصاف اسی کو کہتے ہیں؟ میں شکاریوں کے سر کاٹ کر لاؤں گا اور بہن کو ان سروں پر تھوکنے کو کہونگا۔

آبا نے کلہاڑی اس کے ہاتھوں سے چھین لی۔ اور کہا ——— تم غم سے پاگل ہو گئے ہو۔ انسان کو انصاف کے لئے حیوان نہ بن جانا چاہیے چلو گھر کے اندر جا کر سو رہو"

وہ ہیوتی کو گھر کے اندر لے گیا۔ آبا کو اس بات کا پختہ یقین تھا۔ کہ عدالت ضرور انصاف کریگی۔

× × × ×

× × × ×

کچھ مہینوں کے بعد مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔ شکاریوں کو پانچ سو روپیہ جرمانہ ہوا۔ جو آبا کو دے دیا گیا۔

جب وہ گھر میں آیا۔ نکتا باورچی خانہ میں بیٹھی کھانا بنا رہی تھی۔ ہیوتی بیل کے لئے مالا بنا رہا تھا۔ آبا نے پانچ سو روپیہ کے نوٹ اپنی بیوی کے سامنے رکھے۔ اور بولا "شکاری مجھے یکصد روپیہ دے

رہے تھے۔ لیکن کیا میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں۔ جو ان کی باتوں میں آجاتا! دیکھو عدالت نے پانچ سو روپیہ عوضانہ دلوائے ہیں۔

لیکن مکتا کی ان باتوں سے تسلی نہ ہوئی اور نہ اس نے خوشی ہی محسوس کی۔ بلکہ ان باتوں سے اس کا غم اور بھی بڑھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے وہ غم کا اظہار کرتے ہوئے بولی "تم اس بات کو کیسے سمجھ سکتے ہو جب سے میں نے اپنا شری پتی کھویا ہے تب سے میرے دل میں ایک جگہ خالی ہو گئی ہے کیا وہ ان روپیوں سے بھری جا سکتی ہے۔ ان نوٹوں کو آگ کی نذر کر دو۔ میں تو ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔ مجھے ان سے نفرت ہے۔

یہ کہکر اس نے نوٹ آگ میں ڈال دیئے۔ ذرا سی دیر میں وہ جل کر راکھ بن گئے۔ آبا حیران رہ گیا۔ زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس نے ہیوتی کے انصاف کی مذمت کی تھی۔ اب اس کے اس مہذب انصاف کو عورت غم زدہ ماں۔ پاؤں سے کچل رہی تھی۔

× × × ×

× × × ×

ایک سال بعد مکتا کے دوسرا فرزند تولد ہوا۔ وہ خوشی سے پاگل ہو کر بولی "دیکھو! میرا شری پتی دوبارہ میرے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ وہی ناک وہی آنکھیں۔ میرا وہی شری پتی میرا دودھ پینے پھر آیا ہے۔

ہیوتی قتل کرنا چاہتا تھا۔ آبا روپیہ لایا تھا۔ لیکن مکتا نے دل کے خون کی دھارا کو دودھ کی دھارا بنا دیا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھی ——

——— "یہ سچا انصاف ہے یا وہ؟"
دونوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

موچی

(کناڑی زبان سے ترجمہ)

"آیئے حضور"

——"ارے اچھی طرح سے تو ہو"

——"جی ہاں دیکھئے تو سہی"

——"کتنا دینا ہے رے؟"

——"کام دیکھ کر دیجئے گا حضور"

——"سو تو ہے ہی۔ مگر تو بھی تو بتا!"

——جو آپ کی خوشی حضور!

——اچھا—— (تھوڑا دور ہٹ کر اس کونے میں)

——"دیکھئے حضور!——"

——" ادھر دیکھ بائیں طرف"

جی ہاں! ٹھیک ہی تو ہوا ہے۔

—— کتنا دے دوں؟

—— میں نے کہہ تو دیا جناب۔

—— کیا کہا؟

کہہ تو دیا کہ جو آپ کی خوشی ہو۔ دیجئیگا۔

—— ہاں۔ اچھا —— بے۔

ٹھیک ہے مالک۔ آپ سب کچھ جانتے ہیں تو پھر میں کیا کہوں؟

تمہارا نام کیا ہے؟

کیوں مالک!

کوئی خاص کام نہیں۔ یونہی پوچھ لیا؟

راچا سرکار! میرا نام راچا ہے"

× × × ×

× × × ×

ایک دم میری نیند کھُل گئی۔ گھبرا کر جو آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ بغل میں کملا سو رہی ہے۔ نیند میں ہی اس نے پوچھا —— " کیا ہے؟"

——" کہاں؟"

——" ابھی آپ کیا کہہ رہے تھے"

——"کیا کہتی ہو؟"

——یہی کہ آپ راچا یا کچھ ——

——ہاں وہی تو کہہ رہا تھا کہ تمہیں کچھ عقل نہیں ہے۔ چپکے سے سو جاؤ۔"

——"نہیں تو سچ مچ ہی کچھ —— "

——"دیکھو تم تو—— "

——کہتی تو ہوں کہ خواب میں آپ کچھ کہہ رہے تھے۔"

——ہش کملا! پگلی کی طرح بکو مت۔"

کملا چپ چاپ سو گئی —— مجھے پھر نیند نہ آئی۔ یوں ہی آنکھیں بند کئے پڑا رہا —— گذشتہ شام کو میں بازار میں اپنے بوٹ کی مرمت کرانے گیا تھا۔ اور وہی بات مجھے اچانک یاد آ گئی۔ راستے میں ایک موچی کا بیٹھ رہنا کوئی کام نہ ہونے پر اپنی لوہے کی کھونٹیوں سے تال دیتے ہوئے اس کا گنگنانا۔ اور مجھے دیکھتے ہی کھونٹیوں کو نیچے رکھ۔ آئیے سرکار! کہہ کر مجھ سے مخاطب ہونا۔ آخر مجھ سے دو پیسے پاکر ہی راضی ہو جانا —— یہ ہی باتیں مجھے یاد آنے لگیں۔ ایک مرتبہ پہلو بدل کر دیکھا تو کملا گہری نیند میں سو رہی تھی۔ کیسی صورت! کیسی خوبصورتی!! میں سر اٹھا کر غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ میرے ساتھ گفتگو کرتے وقت اس کے چہرے پر جو مسکراہٹ تھی۔ وہ اب تک اس کے ہونٹوں پر ناچ رہی تھی —— میں چارپائی سے اٹھ کر دور جا بیٹھا —— یوں ہی سر نیچا کئے —— آنکھیں بند کئے —— پھر

وہی تصویر تال دیتے ہوئے۔ بکھرے ہوئے بالوں والا۔ دھوپ سے سرگرداں وہی موچی۔ وہی! وہی!! ——— اس کی مسکراہٹ! ——— مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ پھر مجھے "آئیے جناب" کہہ کر پکار رہا ہے۔

راجا شاید اپنے گھر میں ——— اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں ——— سو رہا ہوگا۔ وہ اس کی بیوی اور بال بچے ——— میری طرح؟ چھی! نہیں۔ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہاں اور میں کہاں؟ وہ بوٹ مرمت کرنے والا موچی ہے۔ یہاں تو ——— میں۔ میری بیوی۔ خوبصورت محل۔ ملائم بستر۔ اور ضروری سامان راحت۔ ہاں ضروری چیزیں۔ اس کے پاس یہ سب کہاں؟ ——— مگر یہ تو اس کا پیشہ ہے۔ میں کیسا پاگل ہوں۔ اس کی فکر مجھے کیوں؟ ۔ میں کون ہوں ——— اور وہ کون؟ غریبی ——— ہاں غریبی ——— مفلسی! یہ اس کے گذشتہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس کی تقدیر ——— مگر پھر بھی ——— پھر بھی ——— یہ کیا؟ ۔ میری آنکھوں میں آنسو کیوں؟ میں نے آنسو پونچھ لئے۔ مگر کچھ بھی نہ سمجھا۔

(۲)

علی الصبح میں چارپائی سے اٹھا۔ تمام دن نہ جانے کیوں میرا دل بیزار رہا کوئی بھی کام کرنے کی خواہش نہ ہوتی تھی۔ نہ جانے کیسے وقت گذر گیا۔ شام ہوتے ہی میں اسی جگہ پر راجا کی تلاش میں گیا۔ دور سے ہی میں نے اس کو وہاں بیٹھے دیکھا۔ اور جان بوجھ کر بوٹ کے ایک سرے کو توڑ ڈالا۔ ایک پھٹے پرانے کمبل پر اپنے سامان کے درمیان راجا بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے پکارا ——— "راچا!"

——— جی ہاں - کیا ہے سرکار!

——— بوٹ پھر پھٹ گیا؟

——— این کیسے؟ کل ہی تو سلایا تھا مالک!

——— ہاں آج بھی ذرا سی دو۔

راچا میرے چہرے کی طرف لمحہ بھر غور سے دیکھتا رہا۔ بعد میں آہستگی سے اپنی کھونٹیوں کو پیچھے رکھ اس نے میرے بوٹ کو ہاتھ میں لیا۔ بوٹ کو چاروں طرف سے دیکھا اور پھر پانی میں ڈبو دیا۔ آخر سر نیچا کئے بوٹ سینے لگا۔ جب کام پورا ہو گیا تو میں نے پوچھا "کیا دینا ہے رے!"

اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ کچھ نہیں چاہیئے مالک! کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا اسے دیکھ وہ دریائے حیرت میں ڈوب گیا۔ اور میری طرف دیکھنے لگا۔

——— "لو راچا!"

"............"

ڈرو مت۔ لے لو۔

"نہیں سرکار!"

——— کیوں؟

آپ میرے لئے بھگوان کے اوتار ہیں مالک! آپ سے میں پیسہ لوں

——— کچھ پرواہ نہیں۔ لے لو۔

——— یہ کس لئے جناب ؟

——— تم پہلے لے تو لو - وجہ بعد میں بتلاؤنگا -

راچا نے ہاتھ آگے بڑھایا - اور کچھ دیر تک میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھتا رہا - میں نے کہا - چلو میرے پیچھے پیچھے چلو - وہ ڈر گیا - اور تھوڑا ہچکچایا میں نے کہا - ڈرو مت راچا - میں تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچاؤنگا - رفتہ رفتہ اس نے اپنا کمبل کندھے پر ڈال لیا - اور اپنی کھونٹی اور دیگر سامان ایک چھوٹی تھیلی میں ڈال اسے بھی کندھے پر لٹکا وہ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہوگیا - میں نے ایک مرتبہ پھر کر دیکھا چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی سب جگہ ہُو کا عالم - اور سرد ہوا -

میں نے کہا ——— " راچا ! "

جی سرکار !

تمہارا گھر کہاں ہے ؟

وہاں ! چند قدموں کے فاصلہ پر جو بڑے بڑے درخت دکھائی دیتے ہیں - ان کی بغل میں -

گھر ہے یا جھونپڑی !

جھونپڑی ہے مالک !

تم پہلے وہاں جاؤ - پیچھے پیچھے میں بھی آؤنگا -

کیوں سرکار !

کوئی ڈر کی بات نہیں ہے - راچا ! میں صرف تمہارا گھر دیکھنا چاہتا

ہوں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

کیوں؟

آپ جیسے لوگوں کو ہم جیسے غریبوں کی جھونپڑی نہیں دیکھنی چاہئے

غریب پرور!

کیوں نہ دیکھ سکونگا۔ بخوبی دیکھونگا۔

دیکھ کر بھی آپ کیا کریں گے؟

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ آواز بدل کر میں نے کہا ــــ اچا!

کیا ہے جناب؟

تمہارے کتنے بال بچے ہیں۔

چار پانچ ہیں۔

اور تیری بیوی!

چلی گئی مالک!

کیا مطلب؟

چلی گئی صاحب! مرگئی!

کتنے سال ہوئے؟

بہت سال ہوئے۔ یاد نہیں۔

بچے چھوٹے ہیں یا بڑے؟

تمام چھوٹے ہی ہیں حضور!

باتیں کرتے کرتے ہم ایک ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کے پاس پہنچے۔ راجا جلدی جلدی چلنے لگا۔ کچھ دور گیا ہی تھا کہ کھڑے ہو کر اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا ——— یہی میرا گھر ہے جناب۔ قدم بڑھاتے ہوئے اس تاریکی میں میں نے جھونپڑی کی طرف دیکھا۔ وہ بہت ہی پرانی جھونپڑی تھی سامنے کا ایک حصہ تو عنقریب گرنے والا تھا۔ ایک پرانا ٹوٹا ہوا دروازہ اندر سے کچھ روشنی باہر آرہی تھی۔ راجا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے دو بچے باہر آئے۔ گویا وہ مفلسی اور نا امیدی کی زندہ تصویر تھے راجا نے بچوں کی طرف دیکھے بغیر ہی میری طرف دیکھ کر کہا "اور آگے نہ چلیئے گا جناب؟"

——— کیوں؟

——— میں نیچ خاندان کا ہوں جناب ..... موچی ہوں "

میں کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر بولا " راجا! یہ لو "

کیا ہے مالک؟

——— لو۔ تمہارے بچوں کے لئے کچھ پیسے ہیں۔؟

——— نہیں جناب یہ میں نہ لونگا۔

——— نہیں تمہیں لینے ہی ہونگے۔

پھر کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔ بعد ازاں راجا نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔" آج نہیں جناب کل دیکھا جائیگا " اس کی آواز سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ آنسو بہا رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ پیچھے کی

جانب قدم اٹھانے لگا۔ اس نے کہا۔ بہت اندھیرا ہے۔ جناب کیا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟ میں نے کہا۔ نہیں۔ صرف میرے لئے تمہیں تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں لیکن اس نے سنا نہیں۔

دوسرے روز شام کو اندھیرا ہونے کے بعد میں پھر راجا کی تلاش میں نکلا۔ میں اس جگہ گیا جہاں راجا ہر روز بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن وہ وہاں نہیں تھا میں اس کی جھونپڑی کی طرف اکیلا ہی چل پڑا۔ مجھے راستہ معلوم تھا۔ کچھ دور چلنے پر جھونپڑی بھی دکھائی دی۔ مگر اندر سے روشنی نہیں آ رہی تھی۔ میں نے زور سے پکارا راجا!۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ آگے بڑھ کر دروازے کے پاس کھڑا ہوا۔ پھر پکارا۔ جواب ندارد۔ ہر طرف سنسان۔ جھونپڑی کا دروازہ کھلا تھا۔ پکارتے ہوئے میں نے جھونپڑی کے اندر قدم رکھا۔ اندر سے ٹھنڈی ہوا آئی۔ جھونپڑی کے اندر اور باہر سب جگہ تاریکی ہی تاریکی تھی۔ میں نے چاروں طرف ڈھونڈھا۔ پکارا مگر لاحاصل۔ راجا کہیں نہ تھا۔ باہر آیا۔ دروازے کے پاس کھڑے ہو کر سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ راجا نہیں ہے۔ بہت ہی دور تاریک سنسان جگہ سے کسی نے جواب دیا۔ "راجا نہیں ہے۔"

میں ششدر رہ گیا اور پھر اس تاریکی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے میں پتھر کی مورت کی مانند کھڑا ہو گیا۔

رات کو جب بستر پر لیٹا تو کملا پاس آ کر کھڑی ہو گئی اس وقت میں اپنے آپ میں نہ تھا۔ اس روز شام کا تمام نظارہ میرے دل

پر نقش ہو گیا۔ دکھ سہہ نہ سکنے کے باعث میں نے اس نظارہ کو دل پر سے مٹانے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ میں کیسا پاگل ہوں۔ میں نے اس کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی غریبی کو مٹانے کے لئے میں حیران ہوا۔ یہ سب کرنے والا میں کون ہوں۔ اس نے کہیں یہ تو نہیں سوچا کہ میں اسے نقصان پہنچاؤں گا۔ میں نے تو خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکا۔ اور اگر سمجھا بھی ہو تو کیا اس نے اس کی انتظار کی؟ ہاں اس نے یہ نہیں چاہا۔ میرے احسانوں کا بوجھ وہ اپنے سر پر اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی زندگی بے غرض زندگی تھی تکلیف اٹھا کر اپنا پیٹ پالنے کی اس کی عادت تھی۔ مگر میں نے اس کی مرضی کے خلاف کام کیا میرے باعث اور صرف میرے ہی باعث وہ یہاں سے چلا گیا۔۔۔۔۔ مگر کہاں۔

ان ہی باتوں کی یاد کرتے کرتے میرا دل پریشان ہو اٹھا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کہیں دور فاصلہ پر اسی معاملہ پر جنگ وجدل ہو رہا ہے میں نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کملا آنکھوں میں آنسو بھرے سامنے کھڑی تھی۔ میرا دل پسیج گیا۔ ایک اندرونی تصویر تھی۔ اور ایک بیرونی۔ مگر دونوں ایک دوسرے کی مخالف۔ اسے کس کا کھیل کہوں؟

پوسٹ آفس

(گجراتی زبان سے ترجمہ)

رات کا پچھلا پہر تھا۔ اگرچہ مطلع صاف ہو چکا تھا۔ لیکن کہیں کہیں آسمان پر چھوٹے موٹے تارے اس طرح جگمگا رہے تھے جس طرح انسانی زندگی کی راحت پذیر یاد چمکتی رہتی ہے۔ اس عالم میں ایک بوڑھا برف کی مانند تیز و تند جھونکوں سے خود کو محفوظ رکھتے ہوئے اپنے جسم کو پھٹے پرانے انگرکھے میں اچھی طرح لپیٹتا ہوا شہر کے درمیانی حصہ پر گامزن تھا۔ آزادی کی زندگی بسر کرنے والے گھروں سے گھنٹی کی دل کش ٹن ٹن ——— مستورات کی نرم آواز کے ساتھ مل کر اس سنسان فضا میں ——— بوڑھے کے ساتھ ساتھ اس طرح آ رہی تھی جیسے وہ اس کی ہمدرد ہو۔ دور سے آتی ہوئی کتے کے بھونکنے کی آواز ——— کسی قبل از وقت بیدار ہونے والے انسان

کے پاؤں کی آہٹ ـــــ یا بے وقت بیدار ہو جانے والے پرندے کی آواز ـــــ یہ سب کچھ آہستہ آہستہ سنائی دے رہا تھا۔ اس کے سوا شہر میں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لوگ میٹھی نیند سو رہے تھے۔ اور سردی کی شدت نے رات کی کثافت میں ایک خاص اضافہ کر دیا تھا۔ موسم سرما کی سردی تیز ہتھیار بن کر مشتاق لوگوں کی طرح ہر جگہ اپنا تسلط جماتی چلی جا رہی تھی۔ بوڑھا کانپتا ہوا آہستہ آہستہ قدم بڑھائے شہر کے دروازے سے باہر ہو کر ایک سیدھی سڑک پر جا پہنچا اور کمزور قدموں کے ساتھ اپنی پرانی لاٹھی کے سہارے آگے بڑھا۔

ایک جانب درختوں کی قطار تھی۔ دوسری جانب شہر کا باغیچہ۔ یہاں سردی زیادہ تھی۔ اور رات کی تاریکی زیادہ ہیبت ناک۔ ہوا میں طوفانی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ اور شکر کے تارے کی دل کش روشنی روئے زمین پر برف کی مانند پھیلی ہوئی تھی۔ جہاں باغیچہ ختم ہوتا تھا۔ وہاں بالکل نئے ڈھنگ کا ایک پُر رونق عالیشان مکان کھڑا تھا۔ اس کی بند کھڑکیوں اور دروازوں سے چراغ کی روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

جس طرح ایک عابد بھگوان کے مندر کی چوٹی دیکھ کر فرطِ عقیدت سے گردن جھکا دیتا ہے اور خوشی محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح اس مکان کی محراب دیکھ کر بوڑھے کا دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ محراب پر لگے ہوئے ایک بوسیدہ سائین بورڈ پر نئے حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ ـــــ "ڈاک خانہ"

بوڑھا ڈاک خانہ کے باہر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اندر سکوت کامل طاری تھا۔ صرف باہمی گفتگو کی معمولی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جیسے کام میں

مصروف چار۔ چھ اشخاص آپس میں گفتگو کر رہے ہوں۔

پولیس سپرنٹنڈنٹ ——— اندر سے آواز آئی۔ بوڑھا چونک پڑا۔ مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اُمید اور محبت اس سردی میں بھی اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

اندر سے مسلسل آواز آنے لگی۔ سارٹر انگریزی خطوط کے پتے پڑھ پڑھ کر پوسٹ بین کی طرف پھینک رہا تھا۔

کمشنر۔ سپرنٹنڈنٹ۔ دیوان صاحب۔ لائبریرین۔ اس طرح ایک کے بعد دوسرا اس طرح دن میں کئی ایک نام بولنے کی مشق کرنے والا سارٹر تیزی سے چھٹیاں پھینکتا جا رہا تھا۔

اتنے میں اندر سے ایک سریلی آواز آئی ——— کوچوان علی بابا! بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے عقیدت سے آسمان کی جانب دیکھا اور آگے بڑھ کر دروازے پر ہاتھ رکھا۔

"گوکل ———

——— کون ہے؟

میری چٹھی ہے نہ؟ ——— میں آیا ہوں۔

جواب میں کسی کے قہقہہ لگانے کی پُرزور آواز سنائی دی۔

بابو جی یہ ایک پاگل بوڑھا ہے۔ یہ ہمیشہ اپنی چٹھیاں لینے کے لئے ڈاک خانہ میں دھکے کھانے آیا کرتا ہے"

سارٹر نے یہ الفاظ پوسٹ ماسٹر سے کہے۔ اتنے میں بوڑھا دوبارہ اپنی جگہ

پر جا بیٹھا۔ پانچ برسوں سے اسے اس جگہ پر بیٹھنے کی عادت ہوگئی تھی۔

پہلے علی ایک ہوشیار شکاری تھا۔آہستہ آہستہ اس نے اس فن میں بہت کمال حاصل کیا جس طرح افیونی بغیر افیون کے نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح وہ شکار کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مٹی کے ڈھیلوں سے مٹی بنے ہوئے چتکبرے تیتر پر جہاں علی کی نگاہ پڑی کہ وہ فوراً اس کے ہاتھ آیا۔ اس کی تیز نگاہ خرگوش کی غاریں میں جا پہنچتی۔ آس پاس کے خشک زرد بھورے گھاس میں چھپ کر کھڑے کان کرکے بیٹھے ہوئے چالاک خرگوش کے بھورے اور زرد رنگ کو کبھی کبھی شکاری کتے بھی نہ دیکھ سکتے۔ وہ آگے بڑھ جاتے اور خرگوش بچ جاتا۔ مگر اٹلی کے گرڑ کی مانند علی کی تیز نگاہ عین خرگوش کے کان پر ٹھہرتی۔ اور دوسرے ہی لمحہ وہ اسے ڈھیر کر دیتا۔ کبھی کبھی علی مچھوڑں کا دوست بھی بن جایا کرتا۔

لیکن جب زندگی کی شام نزدیک آتی دکھائی دینے لگی۔ تو اس شکاری نے اچانک دوسری طرف کا رُخ کیا۔ اس کی اکلوتی بیٹی مریم کی شادی ہوگئی اور وہ سسرال چلی گئی۔ اس کا داماد فوجی محکمہ میں ملازم تھا۔

وہ اس کے ساتھ پنجاب کی طرف چلی گئی۔ اور جس کے لئے علی نے اب تک اپنی زندگی قائم اور صحت بحال رکھی تھی۔ آج پانچ سال ہونے کو آئے۔ اس کی طرف سے خیر و عافیت کا کوئی خط بھی وصول نہیں ہوا تھا۔ اب علی کو معلوم ہوا کہ محبت اور فراق کیا چیز ہے؟۔ پہلے وہ تیتر کے بچوں کو ادھر اُدھر پریشان و سرگردان دوڑتے دیکھ کر ہنستا تھا ——— اس سے وہ اتنا لطف حاصل کرتا تھا جتنا ایک شکاری کو اپنے شکار کو مارنے سے حاصل ہوتا ہے

شکار کا لطف اس کی نس نس میں داخل ہوگیا تھا۔ لیکن جس دن مریم چلی گئی۔ اسے اپنی زندگی بے لطف معلوم ہونے لگی۔ اس دن سے علی نے شکار کرنا بھول کر نگاہ غور سے دھان کے سرسبز کھیتوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

اس کو زندگی میں آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دنیا میں محبت کی پیدائش اور فراق کے آنسو دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس کے بعد ایک روز علی ڈھاک کے درخت کے نیچے بیٹھ کر جی کھول کر رو دیا۔ اس روز سے وہ بلا ناغہ علی الصبح چار بجے اٹھ کر اس ڈاک خانہ میں آیا کرتا۔ اس کے نام کی چٹھی تو کبھی آتی نہیں۔ لیکن اسے خیال ہے کہ شاید مریم کی چٹھی کسی نہ کسی دن آ جائے۔ وہ ہر روز سب سے پہلے ڈاک خانہ میں آ بیٹھتا۔

پوسٹ آفس ——— شاید دنیا کا سب سے زیادہ بے لطف مقام ——— اس کا دھرم کھشیتر یا تیرتھ ستھان بن گیا تھا۔ ایک ہی مقام پر اور ایک ہی گوشے میں وہ ہمیشہ بیٹھا کرتا۔ اس کی حالت کا علم ہو جانے پر سب لوگ اس کا مذاق اڑاتے اور کبھی چٹھی نہ ہونے پر بھی مذاق سے اس کا نام لیکر بیٹھنے کی جگہ سے پوسٹ آفس کے دروازے تک اسے دوڑاتے۔ لازوال اعتقاد اور بے حد صبر سے وہ ہر روز آتا اور خالی ہاتھ لوٹ جاتا۔

علی بیٹھا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک کے بعد ایک چپڑاسی اپنے دفتروں کی چٹھیاں لینے کے لئے آنے لگے۔ اس بیسویں صدی میں زیادہ تر چپڑاسی اپنے افسروں کے خانگی معاملات سے واقف ہوتے ہیں۔ اس لئے تمام شہر کے افسروں کے خانگی معاملات کا اس وقت تذکرہ ہو رہا تھا۔

کسی کے سر پر صافہ تھا۔ تو کسی کے پاؤں میں چمچماتے جوتے۔ اس طرح
سب خاص انداز سے ان معاملات پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کر رہے تھے
اتنے میں دروازہ کھلا۔ چراغ کی روشنی میں۔ سامنے کی کرسی پر ٹوپی بنے کا سامنے لئے
اور پر درد غمگین صورت بنائے۔ پوسٹ ماسٹر بیٹھے تھے۔ جن کے رخساروں پر منہ
پر یا آنکھوں میں جلال نہیں ہوتا وہ انسان زیادہ تر سنار یا دیہاتی سکول
ماسٹر ــــ یا اس بیسوی صدی کے کلرک یا پوسٹ ماسٹر ہوتے ہیں۔

علی ابھی اپنی جگہ پر ہی بیٹھا تھا۔ وہ بے حس و حرکت تھا۔

پولیس کمشنر ـــــــ کلرک نے آواز دی۔ اور ایک مغرور نوجوان نے پولیس
کمشنر کا خط لینے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

سپرنٹنڈنٹ ـــــــ ایک دوسرا چپڑاسی آگے بڑھا۔ اسی طرح
سینکڑوں نام پڑھے گئے۔ یہ سارٹر اس طرح وشنو بھگت کی طرح اپنا ہر
روز کا سبق دوہرایا کرتا تھا۔

آخر سب کے سب چلے گئے۔ علی اُٹھا اور ڈاک خانہ کو آداب بجا لا کر چلا
گیا۔ ایک صدی پہلے کا دیہاتی ـــــــ گویا اس میں کوئی معجزہ ہے۔

"یہ پاگل ہے کیا؟ پوسٹ ماسٹر نے پوچھا۔

حضور کون؟ علی! ہاں بابو جی۔ پانچ برسوں سے یہ برابر خط لینے آتا
ہے ـــــــ خواہ کوئی بھی موسم کیوں نہ ہو۔ اس کا خط شاید ہی کبھی آتا
ہے۔ کلرک نے جواب دیا۔

کوئی بیکار تھوڑے ہی رہتا ہے۔ ہمیشہ چٹھی کون لکھے؟

بابوجی اس کا تو دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔ یہ پہلے بہت بڑے کام کیا کرتا تھا ایک مرتبہ اس نے کسی عبادت گاہ میں کوئی گناہ کر ڈالا۔ اس کا نتیجہ بھوگ رہا ہے۔ پوسٹ مین نے کہا۔

پاگل بڑے عجیب ہوتے ہیں۔

ہاں حضور! احمد آباد میں میں نے ایک مرتبہ ایک پاگل کو دیکھا تھا۔ وہ تمام دن مٹی کا ڈھیر لگایا کرتا تھا بس اور کچھ نہیں۔ ایک پاگل کو ہمیشہ شام کے وقت دریا کے کنارے جا کر ایک پتھر پر پانی ڈالنے کی عادت تھی۔

اجی! ایک پاگل کو ایسی عادت تھی کہ وہ تمام دن ادہرادہر گھوما کرتا تھا ایک دوسرا پاگل ہمیشہ ایک ہی راگ گایا کرتا تھا۔ اور ایک تو ایسا تھا۔ کہ وہ اپنے ہی ہاتھ سے اپنے رخساروں پر چپت لگایا کرتا اور پھر یہ سمجھ کر رونے لگتا کہ کوئی دوسرا آدمی اُسے مار رہا ہے۔

آج پوسٹ آفس میں پاگلوں کی کہانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ہمیشہ اس طرح ایک آدھ قصہ چھیڑ کر اس پر دس پانچ منٹ باتیں کر کے دل بہلانے اور لطف اٹھانے کی تمام نوکروں کو عادت پڑ گئی تھی — — شراب کی عادت کی طرح — آخر کار پوسٹ ماسٹر اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے ہوئے بولے "ان پاگلوں کی بھی ایک دنیا معلوم ہوتی ہے وہ پاگل ہم لوگوں کو پاگل سمجھتے ہونگے۔ اور کبھی ان کی نگاہ شاعر کی نگاہ کی مانند ہوگی"

آخری الفاظ کہتے ہوئے پوسٹ ماسٹر صاحب رخصت ہوئے

ایک کلرک وقت ملنے پر کبھی کبھی سخن پر طبع آزمائی کیا کرتا تھا۔ اسی لئے اسے سب چھیڑتے تھے۔ پوسٹ ماسٹر نے بھی آخری الفاظ اسی لئے ہنستے ہنستے اس کی طرف اشارہ کر کے کہے تھے۔ پوسٹ ماسٹر پہلے کی مانند سنجیدہ رہا۔

ایک مرتبہ بوڑھا علی دو تین روز تک ڈاک خانہ میں نہ آیا۔ علی کے دل کو سمجھ لینے والی۔ ہمدردی سے لبریز عمیق نگاہ پوسٹ آفس کے کسی آدمی میں نہ تھی۔ مگر وہ آیا کیوں نہیں۔ اس پر سب کو تعجب ہوا۔ بعد میں علی آیا۔ وہ اس روز ہانپ رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر شام زندگی کے آثار صاف طور پر دکھائی دے رہے تھے۔

آج علی نے بے صبر ہو کر پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔ بابو صاحب! میری مریم کی کوئی چٹھی آئی ہے۔؟

پوسٹ ماسٹر اس روز بڑی تیزی کے ساتھ گاؤں جا رہے تھے۔ اور ان کی پیشانی اتنی سنجیدہ نہ تھی کہ وہ اس نئے سوال کو برداشت کر سکتی۔

"نہ جانے تم کیسے آدمی ہو؟"

میرا نام علی ہے۔ علی نے جواب دیا۔

درست ہے۔ مگر تمہاری مریم کا نام کسی نے لکھ رکھا ہے کیا؟

لکھ لیجئے نہ صاحب! شائد کسی وقت خط آئے اور میں یہاں موجود نہ ہوں۔ اور آپ کو بے فائدہ پریشان ہونا پڑے۔

جس کی تین چوتھائی زندگی شکار میں گذری تھی۔ اسے کیا معلوم کہ مریم کا نام اس کے باپ کے سوا دوسرے کے لئے دو کوڑی قیمت کا

بھی نہیں۔

پوسٹ ماسٹر نے غضبناک لہجے میں کہا۔ پاگل تو نہیں ہوگیا ہے۔ جا یہاں سے! تیری چٹھی آئے گی تو کوئی کھا نہیں جائیگا۔"

پوسٹ ماسٹر جلدی چلا گیا اور علی دھیمی رفتار سے باہر نکلا۔ باہر ہوتے ہوتے اس نے ایک مرتبہ گھوم کر پوسٹ آفس کی طرف دیکھا۔ آج اس کی آنکھوں میں یتیموں کے سے آنسو جھلک رہے تھے۔ اعتقاد تھا۔ مگر صبر کا پیالہ لبریز ہوگیا تھا۔ اور! اب مریم کی چٹھی کیسے پہنچے گی؟"

ایک کلرک اس کے پیچھے آتا معلوم ہوا۔ علی اس کی طرف گھوما!

"بھیا!"

کلرک چونکا۔ مگر وہ نیک دل انسان تھا۔

"کیوں؟"

دیکھو یہ میرے پاس ہے۔ اتنا کہہ اس نے اپنے پاس کی ایک پرانی ڈبیا سے پانچ اشرفیاں نکالیں۔ کلرک چونک پڑا۔

چونکو مت! تمہارے لئے یہ بڑے کام کی ہیں۔ میرے لائق اب یہ نہیں رہیں۔ مگر ایک کام کروگے؟

کیا؟

وہ اوپر کیا دکھائی دیتا ہے۔ علی نے سنسان آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

آسمان!

اوپر اللہ ہے۔ اس کو گواہ رکھ کر میں یہ اشرفیاں تمہیں دیتا ہوں۔ میری مریم کی چٹھی آئے تو تم نے مجھے پہنچا دینا۔

کلرک حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ پوچھا۔ کہاں؟ کہاں پہنچانی ہو گی؟

"میری قبر پر!"

ایں!

سچ کہتا ہوں۔ آج میرا آخری دن ہے۔ اوہ آخری! ۔ مریم نہ ملی۔ چٹھی نہ ملی۔

علی کی آنکھ میں ایک نشہ تھا۔ کلرک آہستہ آہستہ قدم اٹھائے اس کے پاس سے چلا گیا۔ اس کی جیب میں تین تولہ سونا پڑا تھا۔

× × ×

× × ×

اس کے بعد علی کبھی دکھائی نہیں دیا۔ اور اس کا پتہ لگانے کی فکر بھی کسی کو نہ تھی۔ ایک روز پوسٹ ماسٹر ذرا غمگین نظر آتے تھے۔ ان کی لڑکی وطن میں بیمار تھی۔ اور اس کی خیر و عافیت کی انتظار میں وہ غمگین صورت بنائے بیٹھے تھے۔

ڈاک آئی اور چٹھیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ ایک لفافے کو اپنا سمجھ کر پوسٹ ماسٹر نے جلدی سے اسے اٹھا لیا۔ مگر اس پر پتہ لکھا تھا۔ کوچوان علی بابا!

انہیں بجلی کا دھکا سا لگا ۔ اس طرح انہوں نے چٹھی کو نیچے

پھینک دیا گویا غم اور فکر نے ان کے دل پر اپنا قبضہ جما لیا ہو۔ کچھ لمحوں کیلئے ان کی حاکموں کی سی جبلی عادت جاتی رہی۔ اور انسانی عادت پھوٹ کر باہر نکل آئی۔ انہیں اچانک یاد آگیا کہ یہ اسی بوڑھے کی چٹھی ہے۔ اور شاید اس کی لڑکی مریم کی بھیجی ہوئی ہے۔

"لکشمی داس!" پوسٹ ماسٹر نے آواز دی۔

لکشمی داس اسی آدمی کا نام تھا جسے علی نے اس روز اشرفیاں دی تھیں

"جی کہئیے!"

یہ تمہارے کوچوان علی بابا ——— آج کل کہاں ہیں وہ!

"تلاش کرونگا"

اس روز پوسٹ ماسٹر کی لڑکی کی خیر و عافیت کی خبر نہ ملی۔ تمام رات انہوں نے اسی فکر میں ہی گذار دی۔ دوسرے دن علی الصبح تین بجے وہ دفتر میں بیٹھے تھے۔ چار بجے علی آئیگا۔ اور میں اپنے ہاتھ سے اسے یہ خط دونگا۔ آج یہی ان کی خواہش تھی۔

علی بابا کی حالت اب پوسٹ ماسٹر صاحب کی سمجھ میں آگئی تھی۔ آج رات انہوں نے صبح آنے والی چٹھی کے خیال میں گذار دی تھی۔ پانچ برس تک ایسی طویل راتیں گذار دینے والے سے آج ان کے دل میں پہلی مرتبہ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ ٹھیک پانچ بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پوسٹ مین ابھی تک نہیں آئے تھے۔ مگر انہیں ایسا معلوم ہوا کہ علی نے دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ پوسٹ ماسٹر اُٹھے۔ باپ کے دلی درد کو محسوس

کرتے ہوئے آج وہ جھپٹے۔ اور دروازہ کھول دیا۔

آؤ۔ بھائی علی۔ یہ لو تمہاری چٹھی۔ دروازے پر ایک محتاج بڑھا۔ لکڑی کے سہارے جھکا ہوا کھڑا تھا۔ آخری آنسوؤں کی بوندیں ابھی اس کے رخساروں پر تازہ تھیں۔ اور چہرے کی جھریوں میں سختی کے رنگ پر انسانیت کا برش پھرا ہوا تھا۔

اس نے پوسٹ ماسٹر کی طرف دیکھا اور پوسٹ ماسٹر ذرا چونک پڑے بوڑھے کی آنکھوں میں انسانی جلال نہ تھا۔

کون ہے بابو جی۔ علی ہے کیا؟ —— لکھشمی داس ایک طرف سے آکر دروازہ کے پاس کھڑا ہو گیا۔

پوسٹ ماسٹر اس کی طرف توجہ نہ دیکر دروازے کی جانب ہی دیکھتے رہے۔ مگر وہاں انہیں کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔ حیرت سے انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ مگر دروازے پر بھی کوئی نہ تھا۔ یہ کیا؟۔ انہوں نے لکھشمی داس کی طرف اپنا رخ کیا۔ ——

"ہاں علی بابا! کون تم ہو؟"

حضور! علی بابا مر گیا۔ اس کی چٹھی مجھے دے دو۔

ایں کب مر گیا؟ سچ کہتے ہو لکھشمی داس!

"جی ہاں۔ اس بات کو تو تقریباً تین ماہ ہو گئے ہیں" سامنے سے ایک پوسٹ مین آرہا تھا۔ اسی نے یہ جواب دیا۔

پوسٹ ماسٹر حیران رہ گئے۔ مریم کی چٹھی ابھی دروازے میں

ہی پڑی تھی۔ علی کی تصویر ان کی نگاہ کے سامنے آگئی۔ لکھشمی داس سے آخری دن علی بابا نے کس طرح ملاقات کی تھی۔ وہ بھی اس نے کہہ سنایا۔ پوسٹ ماسٹر کے کانوں میں دروازے کی تھپتھپاہٹ اور نظر کے سامنے علی کی تصویر آکھڑی ہوئی۔ ان کا دل وہم میں مبتلا ہو گیا۔ میں نے علی کو دیکھا ہے۔ یہ محض بھرم تھا۔ یا وہ لکھشمی داس تھا۔

دوبارہ ہر روز کا عمل شروع ہوا۔ پولیس کمشنر۔ سپرنٹنڈنٹ لائبریرین۔ سارٹر جلدی سے چھٹیاں پھینکتا جاتا تھا۔ مگر ہر ایک چٹھی کی طرف پوسٹ ماسٹر اس طرح بہ نظر غور دیکھ رہے تھے۔ گویا اس میں دھڑکتا ہوا دل ہو۔ لفافہ چار پیسے کا ہے۔ کارڈ دو پیسے کا یہ خیال آج غائب ہو گیا۔ مشرقی افریقہ سے کسی بیوہ کے اکلوتے لڑکے کا خط آئے۔ اس کے کیا معنی؟ پوسٹ ماسٹر صاحب بہت سنجیدہ ہوتے جا رہے تھے۔

انسان اگر اپنی نگاہ سے نہیں دوسرے کی نگاہ سے دیکھے تو نصف دنیا اسے سنجیدہ نظر آنے لگے۔

× × ×

اس روز شام کو لکھشمی داس اور پوسٹ ماسٹر آہستہ آہستہ قدم اٹھائے علی کی قبر کی جانب جا رہے تھے۔ مریم کی چٹھی ان کے پاس ہی تھی۔ قبر پر چٹھی رکھ کر لکھشمی داس اور پوسٹ ماسٹر لوٹ آئے۔

لکھشمی داس! کیا آج صبح تم سب سے پہلے آئے تھے؟

جی ہاں!

"اور تمہیں مے کہا تھا"—علی بابا—"

"جی ہاں!"

مگر تب — تب — سمجھ میں نہیں آیا کہ ......

"کیا؟"

ہاں درست ہے — کچھ نہیں۔ پوسٹ ماسٹر نے جلدی سے بات پلٹ کر کہا۔ پوسٹ آفس کا چبوترہ آتے ہی پوسٹ ماسٹر لکھشمی داس سے علیحدہ ہو کر اس معاملہ پر غور کرتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ان کا پرانا دل علی کو نہ سمجھ سکا۔ اس کے لئے ان کے دل میں ہمدردی تھی اور آج بھی ابھی تک لڑکی کی خیر و عافیت کا خط وصول نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اسکی خبر کی فکر میں انہوں نے رات گذار دی تھی۔ حیرت، شک اور تاسف کے ذہن اخسام کے بخار سے جلتے ہوئے۔ وہ اپنے دفتر میں بیٹھ گئے اور نزدیک رکھی ہوئی انگیٹھی میں سے کوئلے کی دھیمی آنچ ان کی طرف آنے لگی۔

گلاب کی خوشبو

(مرہٹی زبان سے ترجمہ)

تمہارے خیال میں ایسا ہو سکتا ہے؟ میں بھی اس بات پر یقین نہیں کرتی —— لیکن اس روز سے میرے دل پر کچھ اس قسم کی دہشت طاری ہو گئی ہے کہ مجھے دوبارہ اس بات کو تجربہ میں لانے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا۔ تم سب مجھے ضدی اور ہر کس و ناکس پر رعب جمانے والی کہا کرتے ہو۔؟ مگر دوسروں پر حکومت چلاتے وقت میں خود اپنے آپ سے کتنی ڈرتی رہتی ہوں۔ اس بات کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔

ششی اور میں بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم دونوں کے والد ایک ہی دفتر میں ملازم تھے۔ دونوں ہی اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہونے کے باعث لاڈلی تھی۔ اور وہ اپنے بھائی بہنوں سے سب

سے چھوٹے ہونے کے باعث والدین کی نگاہوں میں بہت عزیز۔ ہم دونوں کے
خاندانوں کا آپس میں ایسا میل جول ہو گیا کہ اس کو میرا اور مجھے اس کا گھر کبھی بھی
پرایا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی ماں گلاب کو اور میری ماں ششی کو حقیقی بیٹے
کی مانند سمجھتی تھی۔

مرہٹی کی چوتھی جماعت تک ہم دونوں ایک ہی سکول جاتے اور پڑھتے
رہے۔ مگر انگریزی کی چوتھی جماعت تک لڑکے۔ لڑکیوں کے لئے الگ الگ
سکول تھے۔ وہ لڑکوں کے سکول میں انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جانے
لگا اور میں لڑکیوں کے سکول میں داخل ہو گئی۔

میں یہ نہیں جانتی تھی کہ لڑکے اور لڑکیوں کے لئے سکول الگ الگ
کیوں ہوتے ہیں۔ لیکن بڑے بوڑھوں کو لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ مختلف
سلوک کرتے دیکھ کر مجھے اس بات سے زیادہ بھی تعجب نہیں ہوا۔ میں سمجھتی تھی
کہ جس طرح لڑکے اور لڑکیوں کی پوشاک مختلف ہوتی ہے۔ اور خانگی کام بھی
دونوں کے لئے مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کے سکول بھی الگ الگ
رکھے جاتے ہیں۔ ہمارے سکول میں میری ہم عمر لڑکیاں مشکل سے دو تین ہونگی۔
باقی سب کی عمر ہم سب سے بہت زیادہ تھی۔ اور اس قابل نہ تھیں کہ انہیں لڑکیوں
کے نام سے پکارا جائے۔ ہماری یہودی ہیڈ استانی پچاس سالہ بوڑھی ہو جانے
پر بھی ابھی کنواری تھی۔ وہ ہمیں بڑی محبت اور محنت سے پڑھاتی تھی۔ طبیعت کی
بھی بہت نیک تھی۔ لیکن ویسی ہی سخت بھی تھی جتنی نرم۔ دوپہر کو رخصت
کے وقت اگر کسی لڑکی کو اپنے یا اپنی سہیلی کے گھر جانے کی خواہش ہوتی

تو اس کو ان کی اجازت لینی پڑتی تھی۔ کسی طالبہ کے حقیقی بھائی کو بھی اگر اپنی بہن سے سکول میں ملنا ہوتا تو پہلے استانی جی سے مل کر ان کی اجازت سے ان کے سامنے بہن سے گفتگو کرنی پڑتی تھی۔ ان کی اس طرح کی سخت دیکھ بھال سے لڑکیاں برا منایا کرتی۔ اور ان کو صلواتیں سنایا کرتی تھیں۔ لیکن میں کبھی بھی یہ سمجھ نہ سکی کہ استانی جی اس طرح کا سلوک کیوں روا رکھتی ہیں۔ اور کیوں لڑکیاں ان کی اس کارروائی سے برا منایا کرتی ہیں۔ چھوٹے بڑے تمام مردوں سے وہ کیوں ناراض رہتی ہیں۔ مردوں نے ان کا کیا بگاڑا تھا ہے۔ میرے گھر میں والد صاحب۔ چچا صاحب ششی وغیرہ جو تھے وہ بھی مرد ہی تو تھے۔ ان سے کوئی بھی لڑکی ڈرتی نہ تھی۔ میں بھی کبھی کسی مرد سے خوف نہیں کھاتی تھی۔ پھر کیوں ہماری استانی ہی مردوں سے ڈرتی رہتی ہیں۔ میں نے ایک بار کسی سے اس کا سبب پوچھا بھی۔ مگر اس نے تو مجھے ہی بیوقوف ٹھہرایا۔ اس لئے میں خاموش رہ گئی۔ لیکن چار سال تک لڑکیوں کے سکول میں رہ کر بنا کسی کے سمجھائے۔ میں خود بخود کتنی باتیں جان گئی ہوں۔

انگریزی کی چوتھی جماعت پاس کر لینے پر مجھے پھر لڑکوں کے ہی سکول میں داخل ہونا پڑا۔ ششی اور میں دونوں ہی اب ساتھ ساتھ ایک سکول میں پڑھنے لگے۔ گھر سے سکول جانے کے لئے بھی دونوں ساتھ ہی نکل پڑتے۔ لیکن سڑک پر آتے ہی وہ ایک طرف چلنے لگتا اور میں دوسری جانب ہو جاتی۔ گویا ہم ایک دوسرے سے بالکل ناواقف تھے۔ سکول میں ہم لڑکیوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا حق صرف ماسٹروں کو تھا۔ اور وہ بھی صرف سبق پڑھاتے

وقت۔ جب کبھی جماعت میں نئے ماسٹر تشریف لاتے تو سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو دیکھ کر وہ گھبرا جاتے تھے۔ کسی نئی دلہن کو دلہا کا نام لیتے وقت جو تکلیف ہوتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ تکلیف ان ماسٹر صاحب کو پڑھائی کا کام سرانجام دیتے وقت اٹھانی پڑتی تھی۔ لڑکوں کے سکول میں جانے والی ہم لڑکیوں کو آگے کے بینچ پر بیٹھنے کا توحق ہی تھا۔ علاوہ بریں ہمیں اور بھی بہت سی سہولتیں حاصل تھیں۔ مثلاً ہم سے کوئی ماسٹر کبھی سوال نہیں پوچھتا تھا۔ اور کسی بات پر بھی ہمیں سزا نہیں ملتی تھی۔ اس کے علاوہ پچھلی بینچ پر بیٹھا ہوا کون سا لڑکا ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔ یا ہمارے ساتھ بات چیت کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا دوسرے لفظوں میں ہمارا مذاق اڑا رہا ہے وغیرہ وغیرہ دیکھنے کی غرض سے گاہے بگاہے دوران سبق میں معلم کی نگاہ ہماری طرف پھر جاتی تھی۔ اور اس طرح ہمیں سبق پڑھایا جاتا تھا۔ جب میں لڑکیوں کے سکول میں پڑھتی تھی۔ تب سمجھا کرتی تھی کہ سب لڑکیاں اور استانی جی مردوں سے ڈرتی ہیں۔ لیکن اس سکول میں آنے کے بعد مجھے اس کے برعکس محسوس ہونے لگا۔ یہاں تو لڑکے ہم سے ڈرتے تھے۔ معلم بھی ہم سے ڈرتے تھے۔ ہماری وجہ ہی سے وہ ایک دوسرے سے ڈرتے رہتے تھے۔ اور ان کی حرکتوں سے مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ اپنے آپ سے بھی خوف کھاتے ہیں ہم سے خوف کھانے والے ان لوگوں سے لڑکیاں کیسے ڈرتی تھیں استانی بھی کس طرح ڈرتی تھی۔ یہ تمام باتیں مجھے اب حیرت میں ڈالنے لگیں۔

ابتدا سے ہی میں پڑھنے کی آرزو مند تھی۔ میں نے جو کتابیں پڑھ ڈالیں تھیں۔ ان سے مجھے اس بات کا یقین ہونے لگا تھا کہ مردوں کی نسبت

عورتیں کتنے ہی گنا زیادہ شریف اور ذہین ہیں۔ اور جب میٹرک کے امتحان کا نتیجہ نکلا۔ تب مجھے جو وظائف ملے اس سے اس بات کے متعلق میرا رہا سہا شک بھی جاتا رہا۔

میٹرک کا امتحان پاس کر لینے کے بعد کالج میں داخل ہونا آسان کام نہ تھا۔ سکول سے حاصل کردہ تعلیم کے ساتھ وہاں جو عقل وتمیز کی باتیں میں نے سیکھی تھیں۔ ان ہی کی وجہ سے میں کالج میں داخل ہو گئی۔ششی چونکہ میری مانند میٹرک کے امتحان میں اعلےٰ نمبر حاصل کر کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس لئے وہ کالج میں داخل نہ ہو سکا۔ لڑکیوں کے بورڈنگ ہاؤس کی عمارت۔ کالج کے اندر ہی بڑی سڑک سے بہت دور فاصلہ پر واقعہ تھی۔ بڑی سڑک سے وہاں آنے کے لئے جو چھوٹا سا راستہ نکلتا تھا اس کے دہانہ پر ایک بورڈ لگا دیا گیا تھا۔ جس پر لکھا تھا مردوں کو اس راستے سے جانے کی ممانعت ہے۔ اس بورڈ کو دیکھ مجھے اس بورڈ کی یاد آ جاتی تھی جو کبھی عجائب گھر میں زہریلے جانوروں کے پنجروں کی طرف جانے والے راستہ پر لٹکا یا ہوا ہوتا ہے اور جس پر دھوکا دینے کے لئے یہ الفاظ کندہ ہوتے ہیں ”خبردار ہاتھ نہ لگانا۔ زہریلے جانور ہیں“

کبھی کبھی ہم لڑکیاں نہر کی جانب یا پہاڑی پر چہل قدمی کے لئے جایا کرتی تھیں۔ جب کبھی ہم چہل قدمی کے لئے نکلتیں تب ہماری طرف پوشیدہ نگاہ سے دیکھنے والے ہمارے پیچھے پیچھے یوں ہی گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ میری سہیلیاں کبھی کبھی دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ وہ ان مردوں سے ڈرتی ہیں۔ مگر ان کی اس بات پر میں کبھی یقین نہیں کرتی تھی۔ اور میں یہ

ماننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی کہ عورتیں مردوں سے خوف کھاتی ہیں۔ بلکہ میرے تجربے میں تو یہ بات آچکی تھی کہ بیچارے مرد عورتوں سے خوف کھایا کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں نے ایک لڑکے سے کچھ دریافت کیا ——— میرے اس چھوٹے سے سوال کا جواب دیتے وقت اس کی جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے سوال کا جواب دیتے وقت مجھ سے وہ کب چھٹکارا حاصل کریگا اس خیال سے اس کے چہرے کا رنگ اس قدر زرد پڑ گیا کہ اس کی یاد آتے ہی مجھے اب بھی ہنسی آتی ہے۔ وہی لڑکا ہمارے کالج میں سب سے زیادہ چالاک اور منٹ کھٹ (چلتا پرزہ) سمجھا جاتا تھا۔ جو حالت طالب علموں کی ہوتی تھی وہی پروفیسروں کی بھی۔ کالج کے چپڑاسی سے لیکر پرنسپل تک ایسا کوئی بھی مرد نہیں نکلا جو ہم لڑکیوں کے کسی کام میں رکاوٹ ڈال سکے۔

مردوں کے متعلق مجھے جو تجربہ حاصل ہوا تھا۔ اس کا اس جگہ ذکر کرنا بے فائدہ ہے۔ ہاں ششی کے بارے میں میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اس سے کئی گنا زیادہ مہذب اور ذہین ہوں۔ اس بات میں مجھے ذرا بھی شک نہیں تھا۔ مگر مجھے یہ یقین نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ویسا سمجھتا ہوگا ایک بات یقینی تھی کہ وہ اوروں کی طرح مجھ سے ڈرتا نہ تھا۔ اسی بات سے مجھے نفرت تھی۔ میری دلی آرزو تھی۔ کہ اوروں کی طرح وہ بھی میری قدر کرے مجھ سے ڈرتا رہے۔ مگر میری اس دلی آرزو کے پورا ہونے کی مجھے کوئی امید نظر نہ آتی تھی اگرچہ بچپن سے ہی ہم دونوں نے ایک ساتھ پرورش پائی تھی۔ تاہم میری عقل مندی کے بارے میں اس کے دل میں کوئی قدر و

منزلت نہ تھی میری ترچھی نگاہ کا اسے ذرا بھی خوف نہ تھا۔ ایسی۔ ایسی باتوں سے میں اکثر جُبہ امنایا کرتی اور چڑ جاتی تھی۔ شنشی ہے تو کیا اُسے مجھ سے ڈرتے رہنا نہیں چاہیئے؟ پڑھائی میں وہ معمولی قابلیت رکھتا تھا۔ ہر سال جیسے تیسے امتحان میں کامیاب ہو جاتا تھا۔ کبھی فیل نہ ہوتا تھا۔ لیکن پڑھائی کی نسبت کھیل کود میں نیز باتوں پر ہی اس کا زیادہ دھیان رہتا تھا۔ اس کا جسمانی تناسب فولاد کی مانند مضبوط تھا۔ کسی بھی عورت یا مرد سے نظر ملانے سے وہ کبھی ہچکچاتا نہ تھا۔ اس کی چمکیلی آنکھوں سے اس کی بے خوفی اور بے پروائی صاف طور سے ظاہر ہوتی تھی۔ معمولی عقل کا انسان ہونے پر بھی دوسروں پر اس کا رعب چھا جاتا تھا۔ مگر دل میں تکبر پیدا ہو جانے کے باعث مجھے اس سے کچھ نفرت سی ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ کر لیا تھا کہ خواہ جس طرح بھی ہو۔ اسے اپنے آگے سر جھکانے پر مجبور کرونگی نیز اسے اس بات پر آمادہ کرونگی کہ وہ مجھ سے ہمیشہ خوف کھاتا رہے۔

لیکن اگر سچ پوچھا جائے تو کبھی میں ہی اس سے ڈر جاتی تھی۔ کھیل کود اور کسرت کرنے کے باعث اس کے ہاتھ اتنے سخت پتھریلے اس کی کلائی اتنی مضبوط بن گئی تھی کہ وہ کسی پرانے ببول کے درخت کی کٹی ہوئی شاخیں معلوم ہوتی تھیں۔ اُس کے ہاتھوں سے مجھے خوف لگتا تھا۔ بچپن میں کھیلتے وقت جب جھگڑا ہو جاتا تب ان ہاتھوں کا مزا چکھنے کی نوبت مجھ پر آپڑتی تھی۔ اس وقت کے ہاتھ آج کی نسبت کتنے نازک ہونگے؟ اتنا ہونے پر بھی اس وقت کی اس کی چپت میں اب تک نہیں بھولی اس کے شوخ دل اور مرضی

موافق سلوک سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے رہنے پر بھی میں اس سے ڈرتی رہتی تھی۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کی وجہ ڈھونڈنے کی میں نے حتےٰ المقدور کوشش کی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اپنے گذشتہ اعمالوں اور خاندانی عادتوں اور خصلتوں کے باعث قدرتاً مجھے مردوں سے ڈرنا چاہیئے تھا۔ مگر پھر بھی میں نے اسکی طبع پر فتح پانے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

اپنی تعلیم یافتہ اور شادی شدہ سہیلیوں کے ساتھ کبھی کبھی میں اس بات کا ذکر چھیڑتی رہتی تھی۔ ان کی گفتگو سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی خانگی زندگی سے سخت بیزار ہیں۔ ان میں سے تقریباً تمام ہر وقت اور ہمیشہ اپنے شوہر کے ظلم وستم کی شکائتیں کرتی رہتی تھیں۔ مجھے وہ بڑے تعجب کی بات معلوم ہوتی تھی میں ان سے دریافت کیا کرتی کہ اگر آپ کے شوہر آپ پر اتنی سختیاں کرتے اور ظلم ڈھاتے ہیں۔ تو آپ ان کے اس سلوک کے خلاف کیوں آواز بلند نہیں کرتیں۔ آپ کیوں ان سے ڈرتی رہتی ہیں۔ ان میں سے تقریباً تمام یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھیں کہ اپنے شوہروں سے وہ خوف کھاتی ہیں۔ اگر میں ان کا یہ پول کھول دیتی تو وہ ہنسنے لگتیں۔ اور اپنے اپنے شوہروں کی تعریف کے راگ الاپنے لگتیں اور اُلٹا یہ کہہ کر کہ میں شادی کئے بغیر محبت کے پوشیدہ رازوں کو نہیں جان سکتی وہ میری ہنسی اڑانے لگ جاتی تھیں۔

لیکن ان میں سے ایک سہیلی نے میری مندرجہ بالا باتوں کی جو تشریح کی۔ اس سے میرا یہ پختہ یقین ہو گیا کہ عورتیں اپنے شوہروں سے خوف کھاتی ہیں۔

اور میری اس سہیلی نے یہ بات صاف لفظوں میں تسلیم بھی کر لی۔ اس کا قول تھا کہ مردوں کی حیوانی طاقت اور دبدبہ کے باعث عورتوں کو مجبوراً ان سے خوف کھانا پڑتا ہے۔

شوہر کی طاقت برداشت کو ایک حد مان کر اس حد تک اس کی مرضی کے خلاف کام کرنے کے لئے کوئی بھی عورت تیار ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر اس حد کو عبور کر لیا جائے تو مردوں کی طاقت برداشت کے بندھ کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور نہ معلوم وہ بندھ کب اور کس طرح ٹوٹ کر اچھل پڑے۔ یہ کہا نہیں جا سکتا یہی وجہ ہے کہ ہر ایک عورت کے دل میں اپنے شوہر کے متعلق رسم و رواج کا خوف ہر وقت اور ہمیشہ دامن گیر رہتا ہے۔

میں نے اپنی اس سہیلی کے ان الفاظ کے آگے۔ سر تسلیم خم کر دیا۔ مجھ سے اس کی ان باتوں کا کوئی جواب بن نہ آیا۔ خیر کچھ بھی ہو۔ آج عورتوں کی نسبت مردوں کی جسمانی طاقت بہت بڑھی ہوئی ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں۔ مطلب یہ کہ مردوں کو عورتوں پر حکومت کرنے اور رعب جمانے کا جو اختیار حاصل ہے۔ وہ فقط ان کے حیوانی جذبہ کی قوت پر ہی منحصر ہے۔ اور اگر ایسا ہے تو قدیم زمانہ کی وحشیانہ زندگی میں اور موجودہ زمانہ کی روحانی۔ مالی اور مجلسی اختیارات کو عمل میں لانے والی زندگی میں فرق کہاں رہتا ہے۔ کسی ایک حد تک عورت مرد سے خوف کھاتی رہتی ہے۔ اور وہ بھی صرف اس کے حیوانی جذبہ کو مدنظر رکھ کر۔ مگر مرد ایسی محدود حد کے اندر کیوں چلتا ہے۔ کیا وہ بھی کسی سے ڈرتا رہتا ہے اگر ایسا نہیں ہے تو اس کا سلوک ایک حد تک کیوں محدود رہتا ہے میری

سہیلی نے اس کا جو جواب دیا۔ اس نے مجھے اس کی باتوں کو ماننے پر مجبور کر دیا۔
———— اس نے کہا عورتوں کی نسبت مردوں کا دل کمزور ہوتا ہے اور
اس کے دل پر اس خیال سے ہر وقت خوف طاری رہتا ہے کہ ممکن ہے جو کام اس
نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ اس کا انجام بد ہو اکثر اوقات اپنی عزت و آبرو کی حفاظت
کے خیال سے اس کے دل میں ارادوں اور تصورات کے ذریعہ شک پیدا ہو جاتے
ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ جو کام بھی کرتا ہے۔ کافی سوچ وچار کے بعد کرتا ہے۔
مطلب یہ کہ آج دن تک مردوں کے نشوونما کا جو ظہور ہوا ہے۔ وہ مردوں
کے خوف زدہ بلکہ کمزور دل کا نتیجہ ہے۔ اگر ایسا ہے تو شادی شدہ مستورات کی
طرح کنواری لڑکیوں کو بھی چاہیئے کہ وہ مردوں کی اس بری عادت اور دلی کمزوری
سے فائدہ اٹھا کر مردوں کو ڈراتی رہیں۔ اور انہیں اپنے ماتحت کرنے کی کوشش
کریں۔

اگر ششی مجھ سے نہیں ڈرتا تو مجھے اپنی روحانی طاقت اس قدر بڑھانی چاہیئے
کہ جس کے محض تصور سے ہی اس کی جسمانی اور حیوانی طاقت چور چور ہو جائے
وہ مجھے کتنا ہی اچھا کیوں نہ لگے۔ ہم اگر ایک دوسرے کے بچپن سے ساتھی ہیں۔
تو بھی کیا؟۔ وہ مرد ہے اور میں عورت ———— اگر وہ ایک مرد ————
مجھ سے ———— ایک عورت سے خوف نہیں کھاتا ہے تو یہ میری ذاتی
بے عزتی نہیں بلکہ دنیا بھر کی تمام مستورات کی بے عزتی ہے۔ مجھے اتنی طاقت
ضرور حاصل کر لینی چاہیئے کہ جس سے وہ مجھ سے خوف کھانے لگے میں مردوں
سے ہرگز نہیں ڈرونگی۔ بلکہ مردوں کو مجھ سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔

(۲)

بڑے دنوں کی رخصتوں میں میں اور ششی دونوں ہی اپنے اپنے گھر میں واپس آگئے تھے۔ ششی ہر روز میرے گھر آیا کرتا تھا۔ اور میں اسکے گھر جایا کرتی تھی۔ ہمارے دونوں کے خیالات میں شدید اختلاف ہونے پر بھی جب ہم گھر کی راحت پذیر چہار دیواری کے اندر رہائش اختیار کرتے تو ہم ان اختلاف کو بالکل بھول جاتے۔ کالج کی چہار دیواری کے اندر ششی مجھے غیر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ گھر آتا تب اسے میں اپنا ہی مان بیٹھتی۔ اور اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی۔

رخصت کے دنوں میں گھر آنے کے بعد ہمارا یہ ایک دستور سا ہو گیا تھا۔ کہ ہم دونوں ہوا خوری کے لئے ایک ساتھ ہی نکل پڑتے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اس روز شام کو میں اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ وہ آیا۔ لیکن اس کا چہرا روز کی نسبت آج کچھ نرالا ہی دکھائی پڑا۔ اس نے آتے ہی ہمیشہ کی طرح گھل مل کر باتیں کرنے کی کوشش کی۔ مگر بولتے وقت جب وہ بیچ بیچ میں گڑبڑ کرنے لگا تب مجھے معلوم ہو گیا کہ اس کے دل میں متضاد خیالات کا چکر چل رہا ہے۔ اس کے چہرے پر ایسے آثار پائے جاتے تھے کہ جو کبھی کبھی ایسے انسان کے چہرے پر دکھائی پڑتے ہیں۔ جب وہ اپنے دل کے خلاف کسی فیصلہ شدہ خیال کی تعمیل کرنا چاہتا ہے اس کا چہرہ اور آنکھیں دیکھ کر میں ڈر گئی۔

میں ہوا خوری کے لئے تیار ہو بیٹھی تھی۔ ارادہ تھا کہ ششی کے آنے پر چائے پی کر گھر سے نکلیں گے گھر میں اس وقت اور کوئی موجود نہ تھا۔ اس لئے

دوسروں کی غیر موجودگی میں میں نے اس سے کہا۔ ذرا بیٹھو نہ۔ چائے تیار کرتی ہوں۔ چائے پی کر ہوا خوری کو نکلیں گے۔

آج چائے نہیں چاہیئے۔ اس نے کہا۔

"اُوں! بالکل دیر نہیں لگے گی۔ ہیٹر میں ابھی دو تین منٹ میں تیار ہو جائے گی۔ اتنا کہہ کر میں پیالی۔ طشتری اور چائے کی کیتلی لانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

نہیں۔ سچ مچ مجھے آج چائے نہیں چاہیئے۔ اور نہ ہی آج ہم ہوا خوری کے لئے باہر جائیں گے؟

اس کا یہ عجیب ایکسپریشن کر مجھے ہنسی آگئی۔ ششی! اور مجھے کہتا ہے کہ آج ہوا خوری کو نہیں جائیں گے۔ میں حیران ہو گئی۔ ہوا خوری کے لئے جانا تو اس کے لئے بے حد مسرت کی بات تھی؟

میں اپنی میز کی جانب پیٹھ کر کے کرسی پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ میز پر رکھے ہوئے گلدستہ میں پھول تھے۔ ان میں سے ایک گلاب کا پھول میں نے پیشانی پر لگا لیا تھا۔ چونکہ مجھے ہوا خوری کے لئے جانا تھا۔ گلدستہ میں سے پھول لیتے وقت اور پھولوں کی ترتیب ذرا بگڑ گئی تھی۔ اس کا اس بات پر دھیان چلا گیا گلدستہ از سرِ نو سجانے کا بہانہ کر کے وہ گلدستہ کے نزدیک آیا۔ اس نے گلدستہ اچھی طرح سجایا بھی بعد ازاں میری پیٹھ کی جانب میز کے کونے پر وہ بیٹھ گیا۔ مجھے یہ بات اچھی نہ لگی۔

دو ایک منٹ تک ہم دونوں میں سے کوئی بولا نہیں۔

کچھ دیر کے بعد وہ وہاں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ اس پھول کے باعث بالوں کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی ہے۔ یا سر کے بالوں پر پھول کھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ کہنا کوئی مشکل نہیں۔

آج آنے کے بعد وہ ایسے ہی بے ترتیبی۔ بے ڈھنگے پن سے بات چیت کر رہا تھا کہ اس کے اس سوال سے میں چونک اٹھی۔ لیکن کچھ بھی نہ ہوا ہو ایسا بہانہ کر کے میں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

اس نے زیادہ نزدیک آکر اپنے دونوں ہاتھ میرے کندھے پر رکھے اور کہنے لگا۔ خوبصورتی اور خوشبو کو باہم ملانے والا گلاب کی مانند اور کوئی پھول نہیں۔

اور تب مجھے ایسا شک ہونے لگا کہ گویا میرے بالوں میں لگائے ہوئے پھول کو سونگھنے کے لئے وہ جھک گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کے گرم سانس میرے رخساروں کو چھو رہے ہیں ـــــ میں نے فوراً اس کی طرف رخ کر لیا۔

وہ کشمکش میں پڑ گیا۔ میری بھی تقریباً وہی حالت ہو گئی "گلاب کے پھول کو سونگھنے کا یہ طریقہ نہیں،" میں نے غصہ بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ شرم محسوس کر رہا ہے۔ لیکن یہ بات چھپانے کی غرض سے اس نے جھوٹے حوصلے کے ساتھ کہا" کیوں؟ گلاب کے پھول کو کسی بھی طرح سونگھنے پر اس کی خوشبو گلاب کی طرح ہی تو آئے گی"

"بھرم میں ہو تم۔ اگر سیدھے طریقے سے اس پھول کو نہیں سونگھو گے

تو خوشبو کے بدلے تمہارا جسم کانٹوں سے الجھ جائیگا۔ اور پھر کانٹوں کے چبھ جانے سے جسم سے خون نکلنے کی نوبت آجائے گی۔ تماشہ گاہ میں عمل میں لائے جانے والے طریقے عموماً درست نہیں ہوا کرتے سمجھے۔

" اگر کانٹوں سے رگڑ کر خون نکلا تو اس سے خوشبو کی تیزی میں کچھ فرق نہ آئیگا بلکہ خوشبو اور بھی زیادہ تیز ہو جائے گی۔"

" اگر سونگھ سکے تو نہ؟ گلاب کے پھول نے نہ چاہا تو۔ خوشبو نہ دینے کی بات تو اس کی مرضی پر منحصر ہے۔"

" بالکل جھوٹ! قدرت نے ان چیزوں کو ایسی آزادی ہی عطا نہیں کی۔ مرضی ہو یا نہ ہو۔ خوشبو دینا گلاب کا قدرتی فرض ہے۔"

" اچھا۔" اپنی بات کو غلط محسوس کرتے ہوئے بھی میں اپنی شکست ماننے کو تیار نہ تھی۔ میرے دل میں اس وقت ایک قسم کی ضد پیدا ہو گئی تھی۔ اپنے دلی ارادے کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا" اچھا ذرا دیکھو تو خوشبو کیسے آتی ہے؟ اور میں پہلے کی طرح بڑی شان سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

البتہ! کیوں نہ آئے گی خوشبو! کہہ کر وہ آگے بڑھا اور میں سنگ مرمر کے بت کی طرح چپ چاپ بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔

یکایک کیا ہوا معلوم نہیں؛ وہ اس قدر پیچھے ہٹ گیا کہ گویا کسی بچھو نے اسے ڈنک مارا ہو۔ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بہت ہی برے طریقے سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار صاف طور سے دکھائی دے رہے تھے۔ اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کو وہ سونگھنے لگا

اپنے رومال پر اس نے جو عطر چھڑکا تھا اس کی خوشبو تمام کمرے بھر میں پھیل گئی۔ اس نے ایک مرتبہ۔ دو مرتبہ تین مرتبہ حتےٰ کہ کئی مرتبہ اس رومال کو سونگھا۔ اور پھر اس کو اس نے اس طرح پھینک دیا کہ گویا اس میں سے کوئی بدبو نکل رہی ہو۔ پھر دوبارہ خوف زدہ چہرے سے کمرے کے اندر کی کوئی بھی چیز اٹھا کر اسے وہ سونگھنے لگا اس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی دکھائی پڑنے لگیں۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ خوف زدہ نگاہ سے اس نے جب میری طرف دیکھا تو میں سحر اٹھی۔ کیا ہوا یہ جان لینے سے پہلے ہی وہ پاگل کی مانند دوڑتا ہوا کمرے سے بھاگ نکلا ——

میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ بے ترتیب کپڑے پہنے اور سر کے بال کھولے وہ شخص پاگل کی مانند سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ مجھ سے کبھی نہ ڈرنے والے شخص کو میں اپنی مرضی کے مطابق اس طرح ڈرا سکی۔ اس فتح پر میں خوشی سے جامے میں پھولی نہ سمائی۔

(۲۷)

دوسرے دن شام کو وہ ہمیشہ کی طرح ہوا خوری کے لئے جانے کی غرض سے میرے ہاں آئیگا ایسا سمجھ کر میں اس کی راہ دیکھتی رہی۔ مگر وہ نہ آیا۔ دو روز گذر گئے۔ چار روز گذر گئے چھٹی ختم ہونے کو آئی۔ لیکن جب وہ نہ آیا تب میرے دل میں ایک فکر پیدا ہوگئی۔ آخر میں ہی اس کے گھر گئی۔ وہ اس وقت گھر پر تھا۔ لیکن میرے آنے کی خبر پاتے ہی۔ اپنے کمرے میں جاکر اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں اس کی ماں کے پاس جاکر ادھر ادھر کی گپیں ہانک کر اپنے گھر واپس لوٹ آئی۔

اس واقعہ کو آج بارہ سال ہو گئے ہیں۔ بچپن میں ہم دونوں نے ایک ہی جگہ پرورش پائی تھی۔ لیکن اس واقعہ کے دن سے ہم ایک دوسرے سے بالکل بولے تک نہیں۔ ہم کہیں بھی ملیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر ہو لیتا ہے۔ اس کو سمجھانے بجھانے کی غرض سے اس سے ملاقات کرنے کی میں نے از حد کوشش کی۔ مگر بے سود۔ مگر وہ تو میرے سائے کے پاس پھٹکنے کو بھی تیار نہ تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس نے مجھے ایک طویل خط لکھ کر اپنے دلی خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے اس روز کے غیر واجبی سلوک کے متعلق مجھ سے معافی مانگی تھی۔ گذشتہ بارہ سالوں میں میں نے کئی بار اس خط کا مطالعہ کیا ہے۔ اس خط میں تحریر کردہ ایک فقرے کے بارے میں مجھے بہت تعجب ہوتا ہے۔ اور بار بار میں اپنے دل سے پوچھا کرتی ہوں۔ کیا یہ سچ ہے؟ کیا ویسا ہو سکتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو بڑے افسوس کی بات ہے۔

اس نے اپنے خط میں لکھا تھا "اس روز سے کسی بھی چیز کی خوشبو یا بدبو وہ خواہ کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو۔ مجھے بالکل معلوم ہی نہیں ہوتی"۔

دیہاتی اور موجودہ تعلیم

The villager and modern education

(تلیگو سے ترجمہ)

شام کا وقت تھا۔ آفتاب سہاگن کی طرح منہ پہ زرد ابٹن لگائے۔ دریائے گوداوری کے صاف و شفاف اور پاکیزہ پانی میں نہانے جا رہا تھا۔ پرند اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ چوپائیوں نے اپنے گھر کی راہ لی تھی۔ مزدور دن بھر کی کڑی محنت ختم کر شہر کے غل غپاڑے سے بچ کر اپنے اپنے گاؤں کی طرف آرام کرنے جا رہے تھے۔ شہر کے شہری کلب کے احاطہ میں مکھیوں کی طرح جمع ہونا شروع ہوئے۔ اور انہیں میں سے ایک میں دریائے گوداوری کے ساحل کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔

بہت دیر تک تو شہر کی ہوا چلتی رہی۔ ایک جگہ ایک معزز شخص کسی اعلےٰ گھرانے کی خاتون کو مشورہ دے رہے تھے کہ کافی کی جگہ بنگال کیمیکل ورکس کا ایجاد کردہ "پانین" کا استعمال بہت اچھا ہے۔ دوسری جانب دو صرافوں میں

ہندوستان سے ہر ہفتہ ولائت کی طرف جانے والے بیشمار سونے کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اور ایک جگہ کسی سکول کا طالب علم اپنے جاپانی ریشم کے پاجامے اور زرد کار شرٹ پر نازاں اپنے ہمجولیوں کے لباس پر پھبتیاں اڑا رہا تھا۔

چلتے چلتے کچھ فاصلہ پر شہری ہوا کا چلنا بند ہو گیا۔ ایک نئی قسم کی بُو آنے لگی وہ تھی گاؤں کی بُو۔ ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا گوداوری کی سطح پر سے ہو کر درختوں کے پتوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ درختوں کے گول گول ہرے ہرے پتے شام کی سنہری دھوپ میں رنگے ہوئے تھے۔ انکی قدرتی دلاویز رنگت شہر کی موٹروں سے اڑانے والی دھول سے پاک تھی۔ کنارے کے دونو طرف آزادی سے بڑھتی ہوئی جھاڑیوں میں تین لڑکیاں گھوم رہی تھیں۔ سن ان کا ایسا کہ حیا ان کے دلوں میں داخل ہوا ہی چاہتی تھی۔ ان کے پاؤں میں چپل تھے۔ شہری عورتوں کی مانند ریشمی سلیپر نہیں۔ پاؤں کی حفاظت کرنے والے چپل تھے۔ اُن سے اُن کے پاؤں کی شان تو نہیں بڑھی۔ البتہ ان پاؤں کی وجہ سے وہ چپل خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ انکے کپڑے غریبوں کے سے تھے۔ پھٹے پرانے۔ مگر جاپانی نہیں۔ میری آنکھیں شہری مستورات کے بھڑکیلے لباس کو دیکھنے کی عادی ہو گئی ہیں۔ مگر ان لڑکیوں کے گاڑھے کے پہناوے میں سچی خوبصورتی دکھائی پڑی۔ مانگی ہوئی چیزوں اور اپنی سچ کی چیزوں میں یہی فرق ہوتا ہے۔ شہر کی مستورات کی طرح ان کے چہرے کی قدرتی خوبصورتی نے کسی اعلےٰ عمدہ اور نفیس ڈبیا میں بند رہنے والے "پاؤڈر" کی پناہ نہیں لی۔ انکے بناؤ سنگار میں جاپان و انگلینڈ کے نمونے نظر نہیں آئے۔ کنارے پر اُگے ہوئے پلاس

کے پھولوں کی مانند ان کی خوبصورتی قدرتی اور پیدائشی تھی۔ ان جھاڑیوں میں وہ کیا کر رہی تھیں؟ درختوں کی شاخوں پر چہکنے والی چڑیوں کی دیکھا دیکھی وہ بھی تان الاپ رہی تھیں۔ گوداوری کی چھوٹی چھوٹی لہروں نے بھی ان کے سُر میں سُر ملا کر تال دیا۔ مگر شہریوں کے تو اسے سننے کے کان ہی نہیں ہوتے۔

آفتاب کا نصف حصہ دریا کے نیچے ڈوبا ہوا تھا۔ خشک لکڑیاں۔ ٹہنیاں اور جڑھیں وغیرہ جو ایندھن کے کام آئیں ٹوکریوں میں بھر کر وہ تینوں لڑکیاں گھر کا رُخ کئے جانے لگیں۔ جب مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں۔ . . . .

. . . تو راستہ بچا کر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتی آگے نکل گئیں۔ جیسے کوئی سانڈ سے بچ کر نکل بھاگے۔ اگر شہری تہذیب میں میرا دماغ پکا ہوتا۔ تو انہیں انگریزی میں جانور کہہ کر گالی دے بیٹھتا۔ مگر میں نے خوب سوچ کر اپنے کو ہی ویسا مان لیا۔ کیونکہ وہ تھیں اصلی پودوں میں کھلنے والے پھول اور میں تھا نقلی کاغذی پھول۔

میں بھی ان کے پیچھے پیچھے تھوڑے فاصلہ پر چلنے لگا۔ سنکرانت۔ کا تہوار قریب تھا۔ اس لئے وہ گوبردھن کے گیت گا گا کر اپنا دل بہلا رہی تھیں۔ میرے دل میں ان کے ان گیتوں کو سننے کا شوق پیدا ہوا۔ اور اسی خیال سے میں ان کے اور بھی زیادہ نزدیک ہو کر چلنے لگا۔ لیکن انہوں نے گانا بند کر دیا۔ میری طرف گھوم کر انہوں نے اپنی آنکھیں چمکائیں۔ اور آگے بڑھیں۔ میں ذرا ٹھٹھک گیا اور اپنی رفتار سست کر کے ان کے پیچھے ہو لیا۔

گوالوں کے لڑکے اپنی گائے بھینسوں کے ساتھ گاؤں کو واپس جا رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ کیا یہ بھینسیں تمہاری ہی ہیں؟۔ میرے

اس عجیب سوال نے انہیں تعجب میں ڈال دیا۔ سر ہلا کر بولے۔ ہاں ہماری ہی تو ہیں ؟
عورتیں اور مرد شہر کا سودا ختم کر ٹولیوں میں منقسم ہو کر اپنے اپنے گاؤں کی طرف
واپس جا رہے تھے۔ بعض کے کندھوں پہ خالی ٹوکرے تھے۔ جن میں بھر بھر کر وہ
گاؤں کے کچے اور تازہ پھل نیز سبزی ترکاری شہر میں فروخت کرنے روز لے جایا
کرتے تھے۔ چند لوگوں کے ہاتھوں میں شہری چیزوں کی پوٹلیاں تھیں۔ ولایتی اخباروں
کے کاغذوں میں بندھی ہوئی۔ ہر ایک اپنے اپنے مطلب سے جا رہا تھا۔ بے مطلب
بیکار شخص اس وقت اس دریا کے ساحل پر میں ہی تھا۔ پڑھا لکھا۔ مہذب تعلیم یافتہ
معزز شخص اور شہری کہلانے والا۔
وہ تینوں کم سنین گپ شپ ہانکتیں اور ان کا پیچھا کئے میں چپ چاپ گاؤں
کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔ میری نظر کبھی ان کی سڈول گردن پہ جا پڑتی
جو ان کے سر پر رکھی ٹوکری کے بوجھ سے بیسیوں بل کھا رہی تھی۔ اور کبھی غروب ہونے
والے سورج کے سیندوری رنگ میں رنگے ہوئے آسمان کی طرف گھوم جاتی۔
تھوڑی ہی دیر میں ہم ان کے گاؤں میں پہنچ گئے۔ پھوس کے کچے مکان۔ ان پر
کھپریل اور کدو کی بیلیں اور لیپی پوتی دیواریں۔ گاؤں نظر آتے ہی گائیں رنبھاتی ہوئی
اپنے بچھڑوں کے پاس دوڑ گئیں۔ ان کے پیچھے گوالے انہیں کھونٹی سے باندھنے لگے
وہ لڑکیاں بھی اپنے اپنے گھروں میں داخل ہوئیں۔ ان کے باپ اور بھائی بھی محنت
مزدوری کے پیسے لئے تھکے ہارے اس وقت گھر آ رہے تھے لڑکیوں کے لائے
ایندھن سے ان کی ماؤں نے حمام گرم کیا۔ اور اسی سے تمام گھر کا کھانا بھی پکایا
اس دن کا کمایا اناج۔ اور اسی دن کا جمع کردہ ایندھن بس کل پھر ہر روز کی

طرح لڑکیاں ایندھن لائے۔ باپ اور گھر کے بڑی عمر کے لڑکے مزدوری کی
تلاش میں نکلیں گے۔ ان میں اور پرندوں میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ دونوں
کو اس خالق پر۔ ان کو جنم دینے والے پر پورا بھروسہ رہتا ہے۔ جاکر کسی چڑیا
سے سوال کرو کہ وہ روز بروز کھانے کی تلاش میں اتنی پریشانی کیوں اٹھاتی ہے؟
ایک ہی دن اتنا دانہ کیوں نہیں جمع کر کے رکھ لیتی کہ کچھ دن آرام سے بیٹھ کر کھا
سکے؟ وہ تو یہی جواب دیگی کہ جس طاقت نے اس تمام دنیا کو پیدا کیا ہے اسی نے
تمام جانداروں کے لئے کافی اناج اسی میں بٹور کر رکھ دیا ہے۔ میں کہاں سے اکٹھا
کروں؟ لیکن مجھ پڑھے لکھے شہری کو اس بات میں سچائی معلوم نہیں ہوتی؟
سورج کے غروب ہوتے ہی تاریکی اپنا جال پسارنے لگی۔ اہل گاؤں دانہ۔
پانی کرکے آرام کی نیند سونے جارہے تھے۔ گوداوری کے کنارے کنارے
میں شہر کی جانب چل پڑا۔ راستے کے درخت سو رہے تھے۔ ان پر بنے ہوئے
گھونسلوں میں چڑیاں بھی سو رہی تھیں۔ پانی کے تھپیڑوں کی میٹھی آواز سنتا ہوا میں شہر
کی حد پر پہنچا۔ دیکھا کہ لوگوں نے ابھی تک گھروں کا خیال ہی نہیں کیا۔

(۲)

مجھے شہر کی زندگی سے نفرت سی ہو گئی۔ اس گاؤں میں جاکر رہائش اختیار
کر لینا اچھا معلوم ہوا۔ ہر روز صبح انہیں گوالوں کے ساتھ گائیوں کو چرانے لے جانا
جنگل کے کسی درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر قدرت سے اٹکھیلیاں کرنا
کتنی پُرمسرت زندگی ہے؟ اسی گوداوری کا پانی پی کر اسی قدرت کی گود میں
سو جاؤں۔ یا انہیں لڑکیوں کے ساتھ میں بھی ایک ٹوکری لئے چپل پہنے

جھاڑیوں کے بیچ میں بندھن چھٹتے گھومتا پھروں۔ان کے سُر میں سُر ملا کر میں بھی خوشی کا گیت گاؤں۔ہمارے راگ کے ساتھ جنگل کے پرندے بھی میٹھی تان اڑائیں۔اور گوداوری اپنی لہروں کی ہل چل سے ہمیں مبارک باد دے۔

لیکن تکلیف یہ معلوم ہوئی کہ میں ایک شہر کا بنا ٹھنا مہذب تعلیم یافتہ ہوں نئی روشنی میں میں نے پرورش پائی ہے۔مجھے یہ لڑکیاں کیونکر اپنے پاس پھٹکنے دیں گی۔کہتے ہیں آدمی کی چھوت لگ جانے سے پرندہ بھی اپنے جھنڈ سے خارج کردیا جاتا ہے۔مجھے وہ اپنے ساتھ کیسے چلنے دیں گی۔

میرے دل میں یہی بات سمائی کہ اس گاؤں میں جاکر رہائش اختیار کروں اور بے فکری کی زندگی بسر کروں۔مگر جب اس بات پر غور کیا تو معلوم ہونے لگا کہ میں اس لائق بھی نہیں ہوں۔میرے ہاتھوں کو محنت مزدوری کا تجربہ نہیں تھا میرے پاؤں کانٹوں۔پگڈنڈیوں اور کھیتوں کی منڈوں پر چل چل کر گھسے ہی نہیں میرے جسم نے سردی و گرمی کو یکساں جھیلنا سیکھا ہی نہیں۔میں ایسا...... ان پڑھ نہ تھا کہ جو کچھ پاؤں اسی میں خوشی مناتا رہوں میں نے تو ایسا علم سیکھ لیا ہے کہ تمام دنیا کو سمیٹ کر اپنے گھر میں رکھ لینے کی ہوس رکھتا ہوں۔میرا دل ہمیشہ سختیوں سے بچنے کی تدبیر سوچا کرتا ہے پاؤں میں وہ خاصیت ہے کہ زمین کو چھوتے ہی بیماری کے جراثیم کو زبردستی اپنی طرف کھینچ لے۔میرے ہاتھ ضخیم کتابوں کا بستہ اٹھانے کے عادی ہوگئے ہیں۔پتھروں کو نہیں۔

پھر بھی میں نے دل کو تسلی دیکر مضبوط بنا لیا۔ان دیہاتیوں کے موافق "لکھہ لیٹرا پڑھ پتھر" تو نہیں ہوں۔اپنے تمام پڑھے ہوئے علوم سے ان تمام ان پڑھ دیہاتیوں

کو واقف کروونگا۔ اس طرح گذر کا راستہ نکل ہی آئے گا۔ کچھ دن اُن کے گاؤں میں رہ کر ان کے سکھ دکھ میں حصہ لوں اپنی خدمت سے ان کو مدد پہنچاؤں۔ تو اہل گاؤں نہال ہو جائینگے۔ تمام عمر میرے قرضدار رہیں گے۔ ان کی احسان مندی سے میں خوب فائدہ اٹھا سکونگا۔ پھر سوچنے لگا۔ یہ کیسا خیال ہے؟۔ ان کو پڑھا لکھا کر اپنا پیٹ پالنے میں بھلائی ہی کیا رہی؟ اہل گاؤں میرا احسان اپنے اوپر کیوں لینے لگے۔ واہ رے میرے پڑھے لکھے دماغ! مزدوری کرنے والے کیا یہ امید رکھتے ہیں کہ ان کے مالک ان کا احسان مانیں۔ ایندھن بٹورنے والی یہ لڑکیاں اپنی ماؤں سے احسان کی امید رکھتی ہیں چرواہے اپنی گائے بھینسوں سے۔ آفتاب اور مہتاب اس بنی نوع انسان سے احسان مندی کا تصور تک نہیں کرتے۔ پھر علم سکھا دینے کی خواہش کرتے ہوئے میں ہی کیوں چاہوں کہ اہل گاؤں میرے احسان مند رہیں۔

کچھ دن وہاں رہنے کے بعد چھوٹا سا گھر بھی بنوا لونگا۔ پھر انہیں ایندھن بٹورنے والیوں میں سے کسی ایک سے شادی کر اسی گاؤں کا ایک گرہستی بن جاؤں گا۔

(۴)

میں نے ہر روز ہوا خوری کے بہانے گوداوری کے کنارے اس گاؤں میں جانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اہل گاؤں سے آہستہ آہستہ واقفیت بڑھانا پھر ان کی رائے سے انکی بستی میں جا بسنا۔ یہی میرا ارادہ تھا۔ ان کے لڑکوں کو ایک مدرسہ کھول کر تلیگو انگریزی حساب۔ تاریخ وغیرہ کی تعلیم دینے کا میں نے فیصلہ کر لیا۔ حوصلہ یہاں تک بڑھ گیا کہ ان تین کم سنوں میں سے کسی ایک کا پیارا بن جاؤں۔ اور پھر اس کے محبت کے قلعہ پر حملہ کرکے اسے قبضہ میں کر لوں۔

ایک دن میں شام کے وقت دریا کے اونچے کنارے پر کھڑا تھا۔ درختوں کے پتے تو ہر روز ہی مجھے دیکھا کرتے تھے۔ اس لئے میں ان کے لئے اجنبی نہ تھا۔ انہیں جھاڑیوں کی طرف میری آنکھیں دوڑ گئیں۔ اور کسی کو ڈھونڈھنے لگیں اس بستی سے وہاں کے پرندے تک واقف تھے۔ لہذا میری اس حرکت وہ ہوس کو دیکھ کر وہ بھی کھِل کھلا کر ہنس پڑے۔ سامنے نہیں۔ وہ دنیا کی قدرت کی طرح بغیر جانے۔ بغیر دیکھے۔ پراسرار دھندلی روشنی میں لپٹی ہوئی بہتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے اوپر موسیقی سے لبریز آسمان کا سائبان تنا ہوا تھا۔ اسی طرف سے ایک سریلی تان اڑ کر میرے کانوں میں مٹھاس بھرنے لگی۔ میں نے ادھر گھوم کر دیکھا تو فاصلہ پر ایک سانولی صورت چمک اٹھی۔ وہی ایندھن ٹٹورنے والی ہنس مکھ نازنین امنگ میں اٹھ کر گا رہی تھی۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک دھان کا کھلیان تھا۔ اور اس میں ایک نوجوان لڑکا کام کر رہا تھا۔ لڑکی کا راگ کان میں پڑتے ہی اس نے گردن اٹھائی۔ اس کی طرف مخاطب ہو جواب میں ایک اپنی چیز گا کر سنائی۔ ان دونوں کے درمیان جو خلا تھی وہ اس راگ کی رفتار کا راستہ بنی۔ اسی راستے سے چل کر دونوں کے دل ایک دوسرے کے نزدیک پہنچے۔ دونوں نے انہیں پکڑ کر چھپا لیا۔ گوداوری یہ سب تماشہ دیکھ کر ہنسی۔ مگر میرا دل بیٹھ گیا۔

اس لڑکے نے کھیت کی کیاریوں سے نکل کر لڑکی کی طرف قدم بڑھایا۔ اور وہ بھی ایندھن کی ٹوکری سر پر سنبھالے اس سے ملنے چلی۔ جب آمنا سامنا ہوا تو دونوں ہاتھ میں ہاتھ لئے دریا کے کنارے پر چڑھ آئے۔ اس نازنین کے بدن پر پرانے کپڑوں کی بہار تھی۔ ان پرانے کپڑوں میں سے جوبن

جھلک جھلک کر پھٹا پڑتا تھا۔ اس نوجون کے ہاتھ میں ایک لاٹھی۔ سر پہ پگڑی گھٹنوں تک گاڑھے کی دھوتی۔ اور جسم میں چکناہٹ اور آنکھوں میں چمک!

ان دونوں نے مجھے سامنے کھڑے دیکھا تو فوراً ہاتھ چھڑا لئے۔ ایک دوسرے سے الگ ہو کر چلنے لگے۔ اس لڑکی نے مجھے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ تو سہی مگر ہر روز کی طرح میرا جمع کیا ہوا ایندھن اس روز اس نے نہیں لیا۔ وہ نوجوان بھی مجھ سے واقف تھا۔ مگر بغیر کچھ بولے وہ بھی چلتا بنا۔ کچھ دیر تک میں اسی جگہ حیران و سرگردان کھڑا رہا۔

(۴)

گاؤں کے مکھیا لوگوں سے میری دو باتیں ہو چکیں۔ وہ بولے لڑکوں کو پڑھنے لکھنے کے لئے فرصت ملنا بہت دشوار ہے۔ گذارہ کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ان کے لئے ایشور نے ٹھیک کر ہی رکھا ہے اس مطلب سے پڑھنا لکھنا بیکار ہے۔ پھر میں نے انہیں کئی طرح سے سمجھا بجھا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہا۔ جواب ملا علم پیٹ پالنے کے لئے ہی نہیں سیکھا جاتا۔ علم کے ذریعہ روح کو پہچاننا ہی انسان کا اعلےٰ مقصد ہے۔ وغیرہ وغیرہ مگر یہ باتیں زبان سے نکالتے وقت اندر کی روح چٹکیاں لے رہی تھی۔ تم نے گذارہ چلانے کی غرض سے ہی یہ علم سیکھا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اسی مطلب سے سیکھتے ہیں۔ اور تم اسی غرض سے ان دیہاتی لڑکوں کو سکھانا چاہتے ہو۔

ان لوگوں نے مجھ سے سوال کیا۔ آپ ہمارے بچوں کو کیسی تعلیم دیں گے میں نے ان سب کا نام لیا۔ انگریزی۔ تلنگو۔ ہندی۔ حساب۔ جغرافیہ تاریخ

وغیرہ۔ میری لمبی فہرست سُن کر وہ لوگ بولے۔ ہمارے گاؤں سے ایک لڑکی تمہارا
ہی علم پڑھنے کو شہر میں چلی گئی تھی۔ وہاں سے کوئی آکر اسے یہاں سے لے
گیا تھا۔ کیونکہ وہ یتیم تھی سب ماں باپ کے تھی۔ آخر اس نے سیکھا کیا؟ بناؤ سنگار
کی امٹ چاہ۔ اپنے دیوی دیوتاؤں کا مذاق اڑانا۔ اپنے گاؤں اور برادری کے
بھائی بہنوں سے نفرت کرنا۔ اپنے مذہب وملت سے نفرت اور سب سے
بڑی بات شادی نہ کرنا۔ لیکن کنواری رہنے میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ کوئی
اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ اس طرح کا جواب دیکر ان لوگوں نے صاف جواب دے
دیا کہ انہیں ویسی تعلیم درکار نہیں جو انہیں دیوتاؤں سے نفرت کرنا سکھائے
چٹک مٹک بناؤ سنگار کا شوق ان کے دل میں پیدا کرے۔ اور شادی
کی رسم کا خاتمہ کروے۔ آخر کو اتنا مان لیا کہ اگر میں چاہوں تو رات کے وقت
راماین۔ مہابھارت اور بھاگوت پڑھ کر سنا سکتا ہوں۔ لیکن ایسی ان ہونی بات!
شاعری تو میں نے انگریزی کی ہی پڑھی تھی۔ تلیگو میں تینتیس فیصدی سے زیادہ
نمبر میں نے کبھی بھی حاصل نہ کئے تھے۔ میں ان کے سامنے کس طرح راماین
کے معنی کر سکونگا۔ یہ کسی طرح ناممکن سے کم نہیں۔ بغیر زبان تک ہلائے
وہاں سے رخصت ہو چلا آیا۔

وہی شام کا وقت۔ وہی گوداوری کے کنارے کا راستہ۔ گاؤں کو
لوٹ جانے والے عورت مرد کی وہی ٹولیاں۔ بدستور میری آنکھیں ان ہی
جھاڑیوں میں جاکر اُلجھ گئیں۔ مگر صاف صاف نظر آیا کہ جھاڑیاں مجھے دیکھ کر
ہنس رہی تھیں۔ ان کے بیچ میں بن دیوی کی مانند پھرنے والی اُس

کم سن کو ایک نظر دیکھ لینے کی خواہش سے میری نگاہ دریا کے کنارے کی تلاشی لینے لگی۔ وہ ایک جگہ ایک اونچے درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی خشک ٹہنیاں توڑ توڑ کر نیچے گرا رہی تھی۔ وہ لڑکا بھی اپنے بیلوں کو اپنے گھر کی جانب واپس لے جاتا ہوا اسی درخت کے نیچے آکر رُک گیا۔ اور لڑکی کی گرائی ہوئی لکڑیاں ٹوکری میں جمع کرنے لگا۔ وہ بھی درخت کی شاخ سے نیچے کود پڑی۔ شاخ پر چڑیا کا پھاندنا آپ نے دیکھا ہوگا۔ درخت سے لپٹ کر بڑھنے والی بیل پر غور کیا ہوگا پودوں کی ڈنڈی سے کھسک پڑنے والے پھول پر توجہ دی ہوگی۔ بس وہی بات تھی۔ نیچے پہنچنے پر اس کی آنکھوں نے لڑکے کے دل میں کچھ کہہ دیا۔ لڑکا ٹکٹکی باندھے ذرا دیر تک دیکھتا رہا۔ اس کی اوپر کو کس کر باندھی ہوئی دھوتی پیٹ پر لٹکتی ہوئی کالے بالوں کی زلف۔ پاؤں کے کڑے۔ ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی طراوت یہ سب گویا اس کی کسی پوشیدہ بات کو اس پر ظاہر کر رہے تھے۔

لڑکے نے سہارا دیکر ٹوکری اس کے سر پر رکھ دی۔ دونوں میٹھے سروں سے گاتے چلے جا رہے تھے۔ پودوں کے پھول ایک ایک کرکے ان پر برس پڑے۔ دریا کے کنارے پر اُگے ہوئے ٹیسو کے دو پھول توڑ کر لڑکے نے اس کے کانوں میں پہنا دیئے۔ پرندے چہک چہک کر اپنی خوشنودی کا اظہار کر رہے تھے۔ سورج کی لمبی لمبی شعاعوں نے ندی کے کنارے کو سنہری رنگ سے رنگ دیا۔ شام کی روشنی میں ان کے چہرے چمک اُٹھے۔ گوداوری انہیں ٹھنڈی ہوا کی معرفت اشیرباد دے رہی تھی۔

جب وہ دونوں میرے نزدیک پہنچ گئے۔ تو میں نے انہیں آخری بار جی بھر کر دیکھا اور ان سے رخصت مانگی۔ لڑکے نے چلتے چلتے کہا۔ مہاراج ہمیں کبھی نہ بھولئے گا۔ لڑکی سر جھکاتے ہوئے بولی۔ بھیا پھر ہماری بستی میں کب چلے آؤ گے۔

مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ لڑکی اپنے تمام جسم سے عضو عضو سے میری ہنسی اڑا رہی تھی۔ جب وہ بہت دور نکل گئے اور آنکھوں کے آگے شام کی دھندلی تاریکی کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا تب میں نے گوداوری کی طرف رُخ کیا۔ صاف صاف دیکھا کہ وہ بھی مجھ پر ہنس رہی تھی۔

پریم

(بنگالی زبان سے ترجمہ)

نوجوان راہب اونی لبادہ اپنے نحیف و نزار جسم پر لپیٹے آنکھیں بند کئے دنیا و مافیہا سے بے خبر یادِ خدا میں مشغول خانقاہ کے اندر بیٹھا تھا۔ مٹی کا چراغ جل رہا تھا۔ اور اس کی مدھم روشنی خانقاہ کی تاریک فضا میں جگنو بن کر چمک رہی تھی۔ سکوت کا عالم تھا یکایک فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ خانقاہ کا دروازہ کھل گیا اور ایک حسین و جمیل عورت رباب ہاتھ میں لئے خانقاہ میں داخل ہوئی اس کی خوبصورت سنہری زلفیں شانوں پر بل کھا رہی تھیں۔ اور خوبصورت کتابی چہرہ آفتاب کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ رقاصہ تھی۔ حسین رقاصہ۔ جوانی کے نشہ میں چور۔ اٹھکھیلیاں کرتی ہوئی صحن کو طے کرنے کے بعد راہب کے پاس آکر کھڑی ہو گئی اس

کے نیلگوں لباس پر ٹکے ہوئے جواہرات چراغ کی مدھم روشنی میں ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے تھے اور آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی۔اس نے راہب سے کہا۔

"تم یہاں بیٹھے ہو۔اس تاریک دنیا میں۔چلو میرے مکان پر جہاں تمہیں مسرت انبساط اور عیش و طرب کے تمام سامان مہیا ہونگے"

راہب مسکرایا اور کہنے لگا "ابھی نہیں۔ وقت آنے پر میں خود تمہارے پاس پہنچ جاؤنگا"

(۲)

رقاصہ دل شکستہ ہوگئی۔اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا۔ اس نے رباب کے تاروں کو درست کیا۔اس کی لانبی لانبی مرمریں انگلیاں رباب کے تاروں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگیں۔وہ ستار کی دلفریب سروں میں اپنی آواز ملاکر گانے لگی۔اس نے دل سوز اور جانگداز سے میں ایک گیت گایا۔

"پربھو!

تیری نگری پریم سے خالی ہے۔

میں نے پریم پجاریوں کو پہاڑوں صحراؤں۔مندروں اور خانقاہوں میں ڈھونڈھا۔

رات کے تاروں اور دن کی تجلیوں میں تلاش کیا۔

سرمایہ داروں کے رفیع الشان محلوں اور ناداروں کے جھونپڑوں میں دیکھا۔

لیکن مجھے پریم نظر نہیں آیا۔

پربھو!

تیری دنیا میں پریم نہیں۔

زر کے بندے اور حسن کے پجاری بہت ہیں۔

لیکن کوئی ایسا نظر نہیں آتا۔

جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دے۔

اور طالبان حقیقت کو راستی کی راہ دکھائے۔

اور بھٹکے ہوؤں کو منزل مقصود پر پہنچائے۔

پربھو!

تیری نگری ایسے پریم سے خالی ہو چکی ہے۔

پربھو!

رقاصہ کا گیت ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ نوجوان راہب کانپتا ہوا اٹھا۔ اس کی ٹانگیں غصہ کی وجہ سے لرز رہی تھیں۔ اور آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ اس نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا ــــ "حسین ناگن! گناہوں سے اُکتا کر پریم نگری کی تلاش میں پھر رہی ہے۔ عورت کتنی مکار اور فریب کار ہوتی ہے"

راہب نے رقاصہ کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ابھی تم پر روپ ہے۔ جوانی ہے۔ جوبن ہے۔ جاؤ! زرداروں کے محلوں کی زینت بنو۔ اپنے حسن کی خیرات کھاؤ۔ ہم خانقاہ نشینوں کے متاع ایمان پر ہاتھ صاف کرنے کے لئے یہاں آئی ہو۔ جاؤ ــــــ تمہاری آنکھوں کی شوخی۔ تمہاری شرارت۔ خبث باطن کو ظاہر کر رہی ہے"

راہب نے رقاصہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے خانقاہ سے باہر نکال دیا۔ رقاصہ یہ کہتی ہوئی شہر کو چل دی "پربھو! تیری دنیا پریم سے خالی ہے۔

(۲۷)

اس واقعہ کے بیس سال بعد موسم بہار میں راہب خانقاہ سے نکلا۔ میلا کچیلا اونی لبادہ اس کے نحیف بدن کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ ماہتاب تاروں کے جھرمٹ میں چمک رہا تھا۔ اس کی روپہلی کرنیں گھاس کے سبز مخملی فرش پر لوٹ رہی تھیں۔ پھول کھل رہے تھے۔ اور کلیاں مسکرا رہی تھیں۔ لیلائے شب چھوٹے چھوٹے آبدار موتی بہار کے نوشگفتہ غنچوں پر نچھاور کر رہی تھی۔ عطر بیز ہوائیں اشجار کی لانبی لانبی ٹہنیوں سے سرگوشیاں کرتی ہوئی چل رہی تھیں۔

راہب لکڑی کے سہارے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا شہر کی فصیل کے قریب پہنچا۔ اس نے ماہتاب کی روشنی میں دیکھا کہ ایک عورت میلے کچیلے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس زمین پر پڑی کراہ رہی ہے۔ چہرے پر چیچک کے دانے رات کے بیشمار تاروں کی طرح نظر آ رہے ہیں۔ اور پاس ہی ٹوٹا ہوا رباب اور کاسہ گدائی پڑا ہے۔ شہر والوں نے اسے بیماری کے پھیل جانے کے خطرہ کی وجہ سے شہر سے باہر پھینک دیا ہے۔ بوڑھا راہب دنیا کی بے مہری اور ستم آرائی پر مسکرایا۔ اور عورت کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے عورت کا سر اٹھا کر اپنے زانوؤں پر رکھا۔ پانی اس کے خشک ہونٹوں پر چھڑکا۔ زخموں کو صاف

کیا۔ رقاصہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اور دھیمی آواز میں پوچھا۔
"کون؟"
راہب نے جواب دیا۔ "پریم!"

ہمارے کتب خانہ کی خصوصیتیں

۱۔ ہمارے ہاں سے اعلیٰ پایہ کے جاسوسی تاریخی معاشرتی اور اخلاقی ناول و ادبی کتب ہر ماہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کوئی مخرب الاخلاق کتاب شائع نہیں کی جاتی۔

۲۔ ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ مصنفوں۔ مترجموں سے ہمارا انتظام ہے۔

۳۔ ہندوستان بھر کے بہترین کتب خانوں اور اداروں کا مال ہمارے ہاں سے مہیا ہوسکتا ہے

۴۔ علاوہ اردو زبان کے ہندی کے عمدہ عمدہ ناول۔ دھارمک کتب اور پولیٹیکل لٹریچر کا کافی سٹاک ہمارے ہاں ہر وقت موجود رہتا ہے۔

۵۔ علاوہ ناولوں کے ہر قسم کی مذہبی۔ اخلاقی اور استری سکھشا کے متعلق اعلےٰ اعلےٰ کتب ہمارے ہاں سے طلب فرماویں۔

۶۔ آرڈروں کی باقاعدہ باحتیاط اور بارعائت تعمیل کی جاتی ہے۔ ہماری غلطی ہونے کی صورت میں خریدار کی ہر طرح سے تسلی کر دی جاتی ہے۔

۷۔ سکول لائیبریری۔ ریلوے انسٹی ٹیوٹ۔ اور دیگر لائبریریوں کو ہر قسم کی سہولیت اور رعائت دی جاتی ہے۔

۸۔ ہمارے ہاں سے ملک کے مایہ ناز لیڈروں اور بہترین ادیب۔ لوک مانیہ تلک مہاتما گاندھی۔ لالہ لاجپت رائے۔ منشی پریم چند۔ منشی تیرتھ رام فیروزپوری گوری شنکر اختر سوامی دویکانند سوامی رام تیرتھ۔ مرزا ادیب راجہ مہدی علیخاں۔ پروفیسر رام سروپ کوشل۔ بابو شیوبرت لال ایم۔ اے ڈاکٹر رابندرناتھ ٹیگور وغیرہ کی بہترین کتب شائع ہو چکی ہیں۔ اور شائع ہوتی رہتی ہیں۔

۹۔ مستقل خریداروں کو خاص رعائت سے کتب مہیا کی جاتی ہیں۔

۱۰۔ علاوہ بریں ہمارے جہاں سے ہر قسم کی ہندی کتب بھی بارعائت مل سکتی ہیں

۱۱۔ تاجران کتب کو خاص رعائت دی جاتی ہے۔ تاجرانہ لسٹ الگ منگوائیں

منشی پریم چند مرحوم

منشی صاحب کے افسانے اور ناول ہمیشہ اصلاح اخلاق پر مبنی ہوتے ہیں اور انکا مقصد شریفانہ جذبات کا برانگیختہ کرنا ہوتا ہے ان کتابوں میں فطرت کا دلچسپ مطالعہ نازک ترین جذبات و احساسات کا بیان ہے۔ زندگی کے معمول کو نہایت خوبی سے سلجھایا ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ منشی صاحب کی تصنیف آپ پڑھیں اور انکی جادو بیانی اور سحر نگاری کے قائل نہ ہو جائیں پڑھ کر دیکھئے

آخری تحفہ

حجم ۲۵۶ صفحات لکھائی چھپائی کاغذ نفیس

قیمت مجلد مع ف ایک روپیہ چار آنہ

یہ وہ افسانے ہیں جو منشی پریم چند نے اپنی زندگی کے آخری زمانے میں لکھے تھے ان کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں حسب ذیل امور کے مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

(۱) مختصر افسانہ ادب کی سب سے زیادہ مؤثر اور دلچسپ صنف ہے۔ جس میں قلم کا مصور کم سے کم خطوط میں زندگی کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر کھینچتا ہے۔

(۲) ہندوستان کے ادیبوں میں مختصر افسانہ پریم چند کا حصہ ہے۔ وہ متفقہ طور پر اس قلمرو کے بادشاہ تسلیم کئے جا چکے ہیں۔

(۳) پریم چند نے ترقی پذیر طبیعت پائی تھی وہ اپنے فن میں یکے بعد دیگرے مدارج کمال کو طے کر رہے تھے۔ ان کا ہر نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہوتا تھا۔

(۴) آخری تحفہ پریم چند کے افسانوں کا نقش آخر ہے۔ یہ اس زمانہ کی تصنیف ہے جب ان کا ذہن زندگی کے نشیب و فراز سے آشنا ہو کر دنیا کے گرم و سرد کا مزا چکھ کر پختہ کار ہو چکا تھا۔ ان کا اسلوب بیان منجھتے منجھتے صاف سادہ سلیس اور رہموار ہو گیا تھا۔ اسلئے انکی ادبی کوششوں کا ماحصل انکے فنی کمالات کا نچوڑ یہی ۲۵۶ صفحے کی کتاب ہے آخری تحفہ اتنا مقبول ہوا ہے کہ دو ایڈیشن ختم ہو چکے ہیں اور تیسرا ایڈیشن قریب ہے کہ ختم ہو جائے۔

آخری تحفہ کے متعلق پنجاب کے چوٹی کے اخبار ٹریبون کی رائے ملاحظہ فرماویں

کئی لوگ اپنے ملک کی خدمت تشدد سے کرتے ہیں۔ اور کئی عدم تشدد سے اسی طرح کئی دھواں دھار تقریروں کو ذریعہ خدمت بناتے ہیں۔ اور کئی اپنی پر زور قلم کو۔ مرحوم منشی پریم چند آخری زمرے کے لوگوں میں سے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی خدمت اپنی تحریر سے کی ہے۔ آخری تحفہ ان تیرہ کہانیوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری دو سال میں تحریر کیں۔ زمانہ حال ہندوستانی سوسائٹی کے جذبات کی منہ بولتی تصویر ہے۔ کہانی بعنوان آخری تحفہ ہے امپیریل پریفرنس کے خلاف آواز اٹھائی گئی ہے اور ہندوستانی ساخت شدہ اشیا کی خرید کا پرچار کیا گیا ہے۔ جیل میں بشمبر دیہات سدھار کا ذمہ اٹھاتا ہے اور گاؤں نواسیوں میں جاگرتی پیدا کرتا ہے۔ قاتل۔ پولٹیکل نوعیت کی کہانی ہے جسمیں دو افراد ہیں ایک لڑکا اور اسکی بوڑھی ماں جو کہ اپنی اپنی جگہ تشدد اور عدم تشدد کی حمایت کرتے ہیں۔ وہ اپنے دیش کو آزاد کرانے کے لئے علیحدہ علیحدہ راستے اختیار کرتے ہیں۔ لیکن دونوں کے راستوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لڑکا ضدی مغرور اور جلد باز ہے۔ اور اس کی تجربہ کار ماں سب سوچ کر دھیرج سے کام کرتی ہے۔ کہانی کی خوبی یہ ہے کہ مصنف خود غیر جانبدار رہے۔ وہ کسی بھی پارٹی کی حمایت نہیں کرتا ہے۔ "برات" "کثرت ازدواج کی برائی" کے برخلاف آواز ہے "نجات" "روندے ہوئے ہریجنوں کی افسوسناک کہانی ہے علاوہ انکے "وفا کی دیوی" "ستی شکار" اور "طلوع محبت" "بے لوث محبت" کے لطیف جذبات کی ترجمان ہیں۔ آخری تحفہ بہت اچھے لہجہ میں تحریر کیا گیا ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے قیمت عہ

اُردو کے مایۂ ناز افسانہ نویس
میرزا دیب بی۔ اے (آنرز)
کے افسانوں کا مجمُوعہ
"موت کا راگ"

اپنی تمام صوری جاذبیتوں کے ساتھ شائع ہو گیا ہے ہر ایک افسانہ انسانی زندگی کیطرح گہرا اور زندگی کی گہرائی کو واضح کرتا ہے۔

مصنف نے الفاظ کے چوکھٹوں میں اس درد کی تصویریں جڑ دی ہیں جسے محسوس تو ہر شخص کرسکتا ہے مگر جسکا کامیاب اظہار ہزاروں میں سے ایک بھی نہیں کرسکتا آپ ان افسانوں کو پڑھینگے تو محسوس کرینگے کہ آپ ان افسانوں ہی کی دنیا میں حرکت کر رہے ہیں اور جب یہ مجموعہ ختم ہو جائیگا۔ تو آپ کو یقین ہو گا کہ آپ کی ایک نہایت عزیز چیز کھو گئی ہے۔

یہ مجموعہ افسانوی دنیا میں ایک انقلاب آفرین اضافہ ہے۔

بہترین کاغذ دیدہ زیب چھپائی اور مجلد کتاب کی قیمت صرف مجلد عہ۔

معیار محبت

اور

دیگر افسانے

پنجاب کے مایہ ناز ادیب حضرت سیاح سنامی کے چیدہ و برگزیدہ افسانوں کا مجموعہ جنمیں سے ہر ایک کہانی تخیل کی رنگینی اور بلند پروازی کا نمونہ ہے حسن و نشاط کے یہ افسانے ایک بار پڑھ کر آپکو مدت العمر نہ بھولینگے مطلب کی گہرائی درد اور تاثیران میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے لکھائی چھپائی دیدہ زیب اعلیٰ کاغذ حجم تقریباً ۲۰۰ صفحات مجلد ایک روپیہ۔

غریب کی آہ

از

ڈاکٹر ہری چند صاحب ہری

یہ ڈاکٹر صاحب کے بہترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے پہلے افسانے پر گورنمنٹ کشمیر کی طرف سے بیش بہا انعام دیا گیا تھا افسانے نہایت پاکیزہ اور نصیحت آموز ہیں کتاب بچوں اور عورتوں کے ہاتھ میں بے کھٹکے دی جاسکتی ہے خوبصورت مجلد قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری گیٹ لاہور